کیا لفظ اہل حدیث دعوتِ دین میں رکاوٹ ہے؟

کیا لفظ اہل حدیث دعوتِ دین میں رکاوٹ ہے؟

خطبہ مسنونہ:

﴿وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ۝﴾ [1]

اس نشست کے لیے گفتگو کا موضوع آپ نے سن لیا ہے کہ کیا لفظ اہل حدیث دعوت دین میں رکاوٹ ہے؟ اس سوال کا پہلے اجمالی جواب یہ ہے کہ رکاوٹ ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ جواب ہاں میں بھی ہے اور ناں میں بھی ہے۔ رکاوٹ ہے اس شخص کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ رکاوٹ بنادے۔ جس کے دل پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دے۔ بقول شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ: اہل بدعت کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ اہل حدیث پر طعنہ زنی کریں گے۔ انھیں گالیاں دیں گے، انھیں ناپسند کریں گے۔ اور اس سے قبل یہ بات ایک عظیم محدث یونس بن عبید جو امام زہری رحمہ اللہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، انھوں نے فرمائی تھی۔ ان کا قول ہے کہ «لَيْسَ شَيْءٌ أَغْرَبَ مِنَ السُّنَّةِ وَأَغْرَبُ مِنْهَا مَنْ يَعْرِفُهَا» اس دنیا میں سب سے زیادہ اجنبی چیز

[1] الأعراف 7:170.

نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے اور حدیث سے بھی زیادہ اجنبی اہل حدیث ہیں۔ ان کے اس قول کا معنی یہ ہے کہ اس دنیا میں دین کی جس چیز پر سب سے زیادہ ظلم ہوتا ہے اور لوگ جسے ناپسند کرتے ہیں وہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے۔ کوئی کلمہ گو ایسا ہے جو حدیث کا منکر ہے۔ جو حدیث کو مانتا ہی نہیں۔ حدیث کا انکار کر کے کافر ہوگیا۔ وہ مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہوگیا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو حدیث کو مانتے ہیں لیکن جو حدیث عقل اور رائے کے خلاف آجائے، اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: «لَوْ عَمِلْنَا بِكُلِّ حَدِيثٍ لَسَدَّ بَابُ الرَّأْيِ»[1] اگر ہم ہر حدیث پر عمل کرنا شروع کر دیں تو رائے کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ جبکہ ہماری پہچان تو اہل الرائے ہونا ہے۔ لہٰذا ایسے قانون بناؤ اور ایسے ضابطے بناؤ کہ ان ضابطوں کے شکنجے میں حدیثیں آئیں اور انھیں مسترد کرنا آسان ہو۔ یہ ایک لمبی بحث ہے۔ یہ قول یونس بن عبید کا ہے جو امام مالک کے ہم مکتب اور ہم عصر ہیں۔ ان کا قول ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ اجنبی چیز نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے اور حدیث سے زیادہ اجنبی اہل الحدیث ہیں۔ تو بہت سے لوگ اس نام کو سننا گوارا نہیں کرتے۔ یہ لفظ اگر رکاوٹ ہے تو اللہ نے بنایا ہے۔ یہ رکاوٹ اللہ نے بنائی ہے۔ ہدایت اللہ کے اختیار میں ہے ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر یہ حجت ہے تو آج عالم کفر اسلام کا نام سننا پسند نہیں کرتا، یہ بھی رکاوٹ ہوگی۔ اسلام کا نام بھی نہ لیں۔ اس سے بڑھ کر اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿ وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴾[2] جب صرف ایک اللہ کا ذکر کیا جائے، ایک اللہ کا

[1] نور الأنوار. [2] الزمر 45:39.

نام لیا جائے تو ان لوگوں کے دل سکڑ جاتے ہیں، تنگ ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک اللہ کا نام سننا پسند نہیں کرتے۔ اور جب ان کے بتوں کا ذکر ہو، لات ومنات اور عزیٰ کا ذکر ہو تو پھر یہ خوش ہوتے ہیں۔ تو پھر کیا مصلحتِ دعوت کی خاطر یہ چاہو گے کہ اللہ کا نام بھی نہ لیں؟ تاکہ لوگوں کو قریب کریں۔ یہ قریب کرنے کا کون سا پیمانہ ہے؟ یہ تو خود ساختہ ایک بیمار عقل کی بیمار سوچ ہے۔ ایک دنیا اللہ کے پیغمبر کا نام سننا پسند نہیں کرتی تو کیا مصلحتِ دعوت کی خاطر اس نام کو اڑا دو گے؟ نہیں۔ دعوتِ دین ایک ایسی چیز ہے جو کسی دینی قاعدے سے دست برداری کو برداشت نہیں کرتی۔ کچھ مان لو، کچھ منوالو، کچھ لے لو، کچھ دے دو۔ یہ تمھارے سیاسی چکر ہیں۔ تمھاری دکان داریاں چمکانے کے چکر ہوں گے۔ ان اصلاحات کو دین نہیں جانتا۔ یہاں تو رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ میں نے میدان محشر میں، جب اللہ نے مجھے منظر دکھایا، تو ایسے انبیاء دیکھے کہ «لَيْسَ مَعَهُ أَحَدٌ»[1] ان کے ساتھ کوئی کھڑا نہیں ہوا تھا، اکیلے کھڑے ہوئے تھے۔ پوری زندگی گزار دی، ایک شخص نے دعوت قبول نہیں کی۔ میں پوچھتا ہوں: یہ ناکامی ہے یا کامیابی؟ لوگ کہیں گے: ناکامی ہے لیکن میرا دین یہ کہتا ہے کہ یہ کامیابی ہے۔ اس نبی نے کوئی سودا نہیں کیا۔ یہ لوگوں کو اکٹھا کرنا، لوگوں کو جمع کرنا، یہ کمال نہیں ہے۔ یہ دین کسی مداری کا کھیل نہیں ہے کہ ڈگڈگی بجائیں اور لوگ جمع ہو جائیں۔ اور یہاں بہتات اور کثرت تعداد سے دین مرعوب نہیں ہوتا۔ «عَلَيْكَ بِطَرِيقِ الْحَقِّ وَلَا تَسْتَوْحِشْ لِقِلَّةِ السَّالِكِينَ وَ إِيَّاكَ وَ طَرِيقَ الْبَاطِلِ وَلَا تَغْتَرَّ بِكَثْرَةِ الْهَالِكِينَ» راہ حق پر چلنے والے تھوڑے ہوتے ہیں، ان کی قلت کو دیکھ کر گھبرانا مت۔

[1] صحيح البخاري، حديث: 5705.

اور بربادی کی راہ پر چلنے والے بہت ہوتے ہیں، ان کی کثرت کو دیکھ کر دھوکا نہ کھانا۔

یہ ہے وہ نورانی قاعدہ جو بہت سے محدثین سے ملتا ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّمَا النَّاسُ كَالْإِبِلِ الْمِائَةِ لَاتَكَادُ تَجِدُ فِيهَا رَاحِلَةً» [1] تم کثرت تعداد کے طالب کیوں بن گئے ہو؟ فرمایا کہ لوگوں کی کثرت کی مثال تو ان سو اونٹوں کی سی ہے جن کو آپ خرید لیں، کھلائیں پلائیں، پالیں پوسیں اور بوقت ضرورت ان سو اونٹوں میں سے سواری کے قابل کوئی بھی نہ ہو، یعنی یہ سودے بازی اپنی تعداد کو بڑھانے کے لیے، یہ کون سا دین ہے؟ افسوس یہ کہ مسلمان اس نکتے کو نہیں پہچانتے۔ جب ہم ریاض میں پڑھتے تھے تو ہمارے ہندوستان کے ایک دوست تھے، انھوں نے بتایا کہ اندرا گاندھی کو کسی نے خبر دی کہ مسلمان ایک ارب سے بڑھ گئے ہیں۔ ان کی تعداد ایک ارب سے متجاوز ہوگئی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جس طرح کے ہیں اس طرح کے ایک ارب ہو جائیں، دو ارب ہو جائیں ہمیں کوئی پروا نہیں۔ بس یہ کوشش کرو کہ مسلمان کہیں تین سو تیرہ نہ بن جائیں۔ اگر یہ تین سو تیرہ بن گئے تو ہماری موت ہے۔ اور ان جیسے ایک ارب کیا دو ارب ہو جائیں کوئی پروا نہیں۔ اس نکتے کو کافر پہچانتے ہیں۔ ناقص العقل عورتیں پہچانتی ہیں۔ ہم نہیں پہچانتے، چنانچہ جو بہت سے دینی مبادیات اور بہت سے قواعد ہیں جو سلف صالحین کی ایک تحریک ہے، ہم اس پر سودے بازی کرنے پر تیار ہیں۔ کچھ چھوڑو، کچھ مانو، کچھ منوالو، کچھ لے لو، کچھ دے دو، کچھ ہماری مان لو، کچھ اپنی منوالو۔ یہ تساہل ہے۔ اس کو دین نہیں جانتا۔ تو یہ لفظ رکاوٹ ہوسکتا ہے اس کے لیے جس کے دل پر اللہ کی مہر ہو۔ اور اگر اللہ کی طرف سے توفیق

[1] صحيح البخاري، حديث:6498.

میسر ہو، اور ہدایت کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے، تو پھر یہ کوئی رکاوٹ نہیں۔

اس اجمالی جواب کے بعد میں نے اس موضوع پر تین حیثیتوں سے بات کرنی ہے۔

ایک یہ کہ لفظ اہل حدیث کیا ہے؟ اہل الحدیث کے فضائل کیا ہیں؟ اور اہل الحدیث کی دعوت کیا ہے؟ اہل الحدیث کا منہج کیا ہے؟ اس تعلق سے میرا یہ دعویٰ ہے کہ اہل الحدیث کے منہج، اہل الحدیث کے عقیدے، اہل الحدیث کے عمل میں کوئی ایک نکتہ ایسا نہیں ہے جو قرآن و حدیث کے خلاف ہو۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ اگر جائز ہوتا تو میں اپنی اولاد کو وصیت کر کے جاتا کہ میری قبر پر، میرے کفن پر اہل الحدیث لکھنا۔ ایک شوشہ ایسا نہیں ہے جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ یہ لفظ بالخصوص برصغیر بھارت، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش اور نیپال میں ایک شعار ہے، ایک پہچان ہے حق و صداقت کی۔ یہ لفظ ہمارے علاقوں میں ایک شناخت ہے صحیح عقیدے، صحیح منہج اور صحیح عمل کی۔

اہل الحدیث کیا ہیں؟ حدیث شرعی اصطلاح میں دو چیزوں کو کہتے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ﴾ [1] اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی سب سے بہترین حدیث۔ سب سے بہترین حدیث اللہ پاک نے اتاری۔ وہ کیا ہے؟ وہی جو اللہ کے پیغمبر نے فرمادی کہ «إِنَّ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ» [2] سب سے بہترین حدیث کتاب اللہ ہے۔ قرآن مجید ہے۔ اور حدیث، اصطلاح محدثین میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے قول، نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے عمل، نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی صفت اور نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی تقریر کا نام ہے۔ قول کا معنی آپ ﷺ کا فرمان، «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» [3] آپ کا یہ فرمان حدیث ہے۔ عمل کا معنی آپ کا فعل مبارک، آپ کا عمل مبارک، جیسے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا طریقۂ وضو۔

[1] الزمر 23:39. [2] صحيح البخاري، حديث:6098، و فتح الباري، تحت هذا الحديث.

[3] صحيح البخاري، حديث:1.

نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا طریقۂ نماز، اس پر مشتمل احادیث، آپ کی حدیثیں ہیں۔ اور صفت کا معنی ہے آپ ﷺ کی صفات، آپ کے آدابِ مبارکہ، احوال، شکل وصورت، داڑھی مبارک، یہ تمام امور آپ کی صفات ہیں۔ اور تقریر کیا ہے؟ تقریر وہ عمل ہے جو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے سامنے کیا جائے اور نبی علیہ الصلاۃ والسلام اس کو دیکھیں، اس پر مطلع ہوں، لیکن آپ اسے منع نہ کریں۔ تقریر کا معنی ایک چیز کو ثابت کرنا، تو آپ کی خاموشی اس کو ثابت کرتی ہے کہ یہ عمل درست ہے کیونکہ نبی معصیت پر، نافرمانی پر خاموش نہیں رہتا۔ نبی کے سامنے غلط کام ہو، نبی خاموش نہیں رہتا۔ تو وہ خاموشی اس عمل کی تقریر اور اس عمل کا اثبات ہے۔ جیسا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی روایت کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے دسترخوان پر سانڈے کا گوشت کھایا گیا۔ آپ نے خود تناول نہیں فرمایا اور نہ ہمیں روکا۔ [1] یہ حدیث تقریری ہے کہ آپ کی خاموشی اس مسئلے کا اثبات ہے، اس کی تقریر ہے کہ یہ حلال ہے۔ تو ان چار چیزوں کا نام حدیث رسول ﷺ ہے۔ ایک لفظ سنت ہے۔ سنت کی تعریف بھی انھی چار چیزوں سے کی گئی ہے۔ سنت بھی پیغمبر علیہ السلام کے قول، پیغمبر علیہ السلام کے عمل، پیغمبر علیہ السلام کی صفت اور پیغمبر علیہ السلام کی تقریر کا نام ہے۔ اگر حدیث اور سنت کو جمع کریں تو ایک باریک سا فرق سامنے آتا ہے لیکن وہ فرق کوئی مستقل فرق نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ حدیث وہ روایت ہے جو صحابی بیان کرے، نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف سے ذکر کرے اور اس روایت کے اندر موجود جو عمل ہے وہ پیغمبر علیہ السلام کی سنت ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کا فرمان: «اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ» [2] یہ حدیث ہے کہ مسواک منہ کو صاف کرتی ہے اور پروردگار کو راضی کر دیتی ہے۔ اس حدیث میں ایک سنت مذکور ہے

[1] صحيح البخاري، حديث: 5391، و صحيح مسلم، حديث: 1946. [2] سنن النسائي، حديث: 5، و سنن ابن ماجه، حديث: 289.

اور وہ ہے مسواک کرنا۔ یہ آپ کی حدیث ہے۔ اس حدیث سے ایک سنت حاصل ہو رہی ہے اور وہ ہے مسواک کرنا۔ تو سنتیں ثابت ہوتی ہیں پیغمبر علیہ السلام کی احادیث سے۔ سنتوں کا مرکز اللہ کے پیغمبر کی احادیث ہیں۔ تو اس لحاظ سے اہل الحدیث اہل السنۃ ہیں، اہل السنۃ اہل الحدیث ہیں۔ اور یہ دونوں صفات سلف صالحین کے دور میں مروج تھیں، موجود تھیں، قائم تھیں اور ثابت تھیں کیونکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کی اساس ایک ہے اور دونوں کا منبع ایک ہے اور وہ ہے پیغمبر علیہ السلام کا فرمان۔ اب حدیث کا معنی واضح ہو گیا۔ حدیث کتاب اللہ بھی ہے اور حدیث اللہ کے پیغمبر کی سنت بھی ہے۔ تو اہل الحدیث کا معنی واضح ہو گیا کہ اہل الحدیث وہ جماعت ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی حامل ہے۔ جس کے پاس قرآن و حدیث کی دولت ہے۔ جن کا عقیدہ کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ جن کا عمل، منہج، خلق اور سیاست کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ جو قرآن و حدیث والے ہیں۔ یہ اہل الحدیث ہیں۔ بتائیے کہ اس میں کیا خرابی ہے؟

جناب محمد رسول اللہ ﷺ پوری زندگی اپنی امت کو کیا دیتے رہے اور جاتے ہوئے کیا فرما کر گئے؟ «تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّةَ رَسُولِهِ» [1] میں تمھارے بیچ دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں جب تک ان دو چیزوں کو تھامے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ ایک کتاب اللہ ہے اور دوسری اللہ کے پیغمبر کی سنت، یعنی میری سنت۔ یعنی دو ہی چیزیں آپ نے پیش کیں۔ پوری زندگی ان پر عمل کیا اور آپ ان پر عمل کرنے کے پابند تھے۔ اللہ پاک کا فرمان تھا کہ ﴿فَاسْتَمْسِكْ

[1] الموطأ للإمام مالك: 2/899، حديث: 1727.

﴿بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ [1] کہ اے محمد! جو آپ کی طرف وحی آرہی ہے بس اسی کو تھام لو۔ ﴿اِنَّكَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ صراط مستقیم پر آپ ہی ہیں۔ صراط مستقیم یہی ہے جو ہم وحی بھیج رہے ہیں، اسے مضبوطی سے تھام لو۔ صراط مستقیم یہی ہے۔ اس پر آپ کاربند تھے۔ اللہ کی وحی کیا ہے؟ فرمایا: ﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ [2] اللہ کی وحی دو چیزیں ہیں: ایک قرآن اور ایک حدیث۔ اسی کو تھام لو، بس صراط مستقیم یہی ہے۔ صرف آپ ہی نے نہیں تھامنا۔ فرمایا ﴿وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ [3] یہ نصیحت، یہ امر اور یہ آرڈر آپ کے لیے بھی ہے اور آپ کی پوری قوم کے لیے بھی، پوری امت کے لیے۔ وہ آپ اس دور کے ہوں، وہ اگلے دور کے ہوں، اس کے بعد کے دور کے ہوں، وہ قیامت تک آنے والے کوئی بھی ہوں، ان سب کے لیے ہمارا یہ آرڈر ہے کہ اللہ کی وحی کو تھام لو۔ اور ساتھ ہی فرمادیا: ﴿وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ﴾ تم سے عنقریب اس بارے میں سوال ہوگا۔ باز پرس ہوگی۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کتاب وسنت کو تھاما یا نہیں۔ یہ بڑی کڑی وعید ہے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پوری زندگی کس چیز کو تھاما؟ کس کی اتباع کی؟ کس کی اطاعت کی؟ اب اگر کوئی اپنے پیرومرشد کا نام لے گا، اپنے امام کا نام لے گا تو اس کا یہ عقیدہ مسترد ہوگا، قابل قبول نہیں ہوگا۔ ﴿وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ﴾ تم سے عنقریب اس بارے میں سوال ہوگا کہ جو ہم نے وحی بھیجی اسے تھاما یا نہیں تھاما؟ تو جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے پوری زندگی انھی دو چیزوں کو تھاما اور آخر میں یہی بات آپ کر کے گئے: «تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ» تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ «لَنْ

[1] الزخرف 43:43. [2] النساء 113:4. [3] الزخرف 44:43.

تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا» جب تک ان دو چیزوں کو تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ تو اہل الحدیث قرآن وحدیث والے، کتاب وسنت والے۔ یہ منہج منہجِ صادق ہے۔

اہل الحدیث کے بڑے فضائل ہیں۔ اور قرآن و حدیث ان فضائل سے بھرا ہوا ہے۔ جابجا ان کا ذکر موجود ہے، ان کے فضائل موجود ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ﴾ [1] ہم قیامت کے دن ہر شخص کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔ ہر ایک شخص کو اس کے امام کے ساتھ اٹھائیں گے۔ امام کسے کہتے ہیں؟ مُقتدا، جس کو تم اپنا لیڈر مانو، اپنا مقتدا مانو، اپنا قائد مانو، اپنا رہبر مانو اور جس کی پیروی کرتے ہو، جس کے احکام پر تم چلتے رہے اور عمل کرتے رہے۔ اس لیڈر کے ساتھ، اس امام کے ساتھ تم کو اٹھائیں گے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ «هٰذَا أَكْبَرُ شَرَفٍ لِّأَصْحَابِ الْحَدِيثِ» یہ آیت کریمہ جماعت اہل حدیث کے لیے سب سے بڑا شرف اور فخر ہے۔ کیونکہ ہر جماعت کا اپنا اپنا قائد ہے۔ اپنا اپنا رہبر اور اپنا اپنا امام ہے۔ اور اہل الحدیث کا ہر دور میں ایک ہی امام ہے اور وہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ۔ پوری دنیا اپنے اماموں کے ساتھ آئے گی اور اہل الحدیث محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آئیں گے۔ اہل الحدیث مشرق کا ہو، مغرب کا ہو، شمال کا ہو، جنوب کا ہو، اس سے پوچھو: تمھارا امام کون ہے؟ تمھارا پیر کون ہے؟ مُقتدا اور رہبر کون ہے؟ بچہ ہو، بوڑھا ہو، مرد ہو، عورت ہو ایک ہی جواب ہوگا کہ ہمارا رہبر اور ہمارا امام محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یہ اہل الحدیث کے لیے ایک بڑا شرف ہے اور بڑے فخر کی بات ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے جو اسی مسئلے کو اور واضح کرے گی۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «أَوَّلُ

[1] بني إسرآءيل 71:17.

«زُمْرَةٌ تَلِجُ الْجَنَّةَ صُوَرَتُهُمْ عَلَى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ ...... قُلُوبُهُمْ قَلْبٌ وَاحِدٌ» [1] سبحان اللہ! فرمایا کہ میری امت کا پہلا گروہ جو جنت میں جائے گا، ان کے چہرے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے اور چاند بھی کون سا؟ چودھویں کا چاند۔ اور فرمایا کہ اس گروہ کا امتیازی وصف کیا ہوگا؟ اس گروہ کی صفت کیا ہوگی؟ فرمایا کہ ان کے دل تو ہزاروں ہوں گے، لاکھوں ہوں گے لیکن ان کا امتیاز یہ ہوگا کہ ان کے دل ایسے ہوں گے جیسے کسی ایک شخص کا دل ہو، حالانکہ ان کی تعداد لاکھوں ہوسکتی ہے۔ ان کے قلوب قلبِ واحد ہوں گے۔ «لَا اخْتِلَافَ بَيْنَهُمْ» [2] ان میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہوگا۔ یہ بھی میرے مسلک اہل حدیث کی تاریخ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آج حق کی پہچان یہ ہے کہ کسی ایک گروہ کا مقلد ہو۔ حنفی ہو یا شافعی، مالکی ہو یا حنبلی۔ دو منٹ کے لیے اس کو اگر مان لیں تو آپ بتائیں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کے آپس میں کس قدر اختلافات ہیں۔ صرف اعمال ہی میں اختلاف نہیں ہے، عقائد میں بھی اختلاف ہے۔ ان کے عقائد اور مناہج تو پروردگار کے بارے میں بھی مختلف ہیں، مثلاً: حنابلہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اس طرح مانتے ہیں کہ کوئی تاویل نہیں کرتے۔ احناف اس بارے میں اشعری ہیں۔ وہ اللہ رب العزت کی صرف آٹھ صفات کو بغیر تاویل کے مانتے ہیں، باقی تمام صفات میں تاویل کرتے ہیں، خودساختہ تاویل، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں بھی ان کے مناہج مختلف ہیں۔ اگر دو منٹ کے لیے مان لیں کہ آج کسی کا مقلد ہونا حق ہے اور یہ حق کی پہچان ہے تو پھر اس اختلاف کا کیا کرو گے جو اصولی اختلاف ہے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جنتی گروہ یہ

[1] صحيح البخاري، حديث:3245، صحيح مسلم، حديث:2834. [2] صحيح البخاري، حديث:3246.

ایسا ہوگا کہ ان کے قلوب، قلبِ واحد ہوں گے۔ اور یہ شان اہل الحدیث کی ہے۔ اہل الحدیث عرب کا ہو یا عجم کا، مغرب کا ہو یا مشرق کا، شمال کا ہو یا جنوب کا، اس کا عقیدہ، اس کا منہج، اس کے اصول ہر مقام پر ایک ہیں، کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کسی مسئلے میں اختلاف ہے تو وہ اختلاف ایک دلیل پر محمول ہے۔ ہر جگہ کا اہل الحدیث ایک بات پر متفق ہے کہ دین یا کتاب اللہ ہے یا سنت رسول اللہ ہے۔ چلو کہیں فہم میں اختلاف ہوگیا تو بات مختلف ہوگئی لیکن یہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ «اَلْقَلِيلُ كَالْمَعْدُومِ» یہ تھوڑی باتیں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ لیکن اساس تو ایک ہے، منہج تو ایک ہے۔ تو یہ حدیث کس پر منطبق ہو رہی ہے؟ کن کے قلوب قلبِ واحد ہیں۔ مقلدین تو ایسے ہیں کہ ان کے مناہج میں بڑا اختلاف ہے۔ عجم میں کچھ اور ہے، عرب میں کچھ اور ہے، ہم جانتے ہیں۔ مشرق میں کچھ اور ہے، مغرب میں کچھ اور ہے۔ بے پناہ اختلاف ہے، حتیٰ کہ اصول میں اختلاف ہے، عقائد میں اختلاف ہے۔ یہاں تو علامت یہ ہے، امتیاز یہ ہے کہ ان کے قلوب ہوں گے قلبِ واحد۔ اس حدیث پر غور کیجیے۔ یہ صحیح بخاری کی حدیث آج دنیا کی کس جماعت پر منطبق ہو رہی ہے؟ اس طرح کے بے شمار صریح دلائل آپ کو ملیں گے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کا فرمان: «لَا تَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللهِ» میری امت کا ایک گروہ اللہ کے امر پر، اللہ کے دین پر ہمیشہ قائم رہے گا۔ اللہ کے دین کا محافظ رہے گا۔ «لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ» [1] جو لوگ ان کی مخالفت کریں گے یا ان کو ذلیل کرنے کی کوشش کریں گے، انھیں مبتلائے ایذا کرنے کی کوشش کریں گے وہ انھیں کوئی نقصان

[1] صحيح البخاري، حديث:3641، و صحيح مسلم، حديث:1037 بعد حديث:1923.

نہیں پہنچا سکیں گے۔ دنیا کوشش کرے گی، لیکن کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اس کا کیا معنی؟ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کی حجت ہمیشہ غالب رہے گی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ لوگ حملے کرکے ان کے علماء کو شہید کریں، یہ ہوسکتا ہے۔ یہ شہادتیں سلف صالحین کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ مساجد تعمیر کریں، لوگ آکر ڈھادیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ان کو لوگ زخمی کریں۔ ان پر لوگ ظلم وستم کریں۔ یہ سب ہوسکتا ہے۔ لیکن انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کی حجت، ان کی دلیل ہر دور میں ثابت اور قائم رہے گی۔ اس تعلق سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ ان کی حجت قائم ہے۔ امام شافعی کا قول ہے: «مَنْ طَلَبَ (عَرَفَ) الْحَدِيثَ قَوِيَتْ حُجَّتُهُ» [1] جو حدیث کا طالب ہوتا ہے، اس کی دلیل سب سے مضبوط ہوتی ہے۔ امام داود کا قول ہے: «لَوْلَا هٰذِهِ الْعِصَابَةُ لَانْدَرَسَ الْإِسْلَامُ» [2] اگر اس زمین کی پشت پر یہ جماعت اہل حدیث نہ ہوتی تو اسلام مٹ چکا ہوتا۔ اسلام ختم ہوچکا ہوتا۔ لیکن یہ جماعتِ اہل الحدیث ہے جس کا یہ امتیاز ہے کہ کتاب وسنت کی حامل اور کتاب وسنت کی محافظ ہے۔ دنیا کچھ کرتی رہے، ان کا ایک ہی وتیرہ ہے اور وہ ہے اِحقاقِ حق، اِبطالِ باطل۔ لوگ حملے کرتے ہیں، مختلف بدعات آتی ہیں، مختلف الحاد آتے ہیں اور یہ ان بدعات کے خلاف، اس الحاد کے خلاف کمربستہ ہوجاتے ہیں، ان کے خلاف کتابیں لکھتے ہیں، ان کے خلاف حدیثیں بیان کرتے ہیں، ان کے خلاف دروس دیتے ہیں اور اس بدعت کے خلاف ایک مضبوط چٹان بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ جماعت نہ ہوتی تو اسلام مٹ چکا ہوتا۔ تو یہ سارے نصوص اہل الحدیث کے فضائل ہیں۔

[1] شرف أصحاب الحديث، رقم: 102. [2] التمهيد لابن عبدالبر: 151/23.

بلکہ بہت سے محدثین نے اس حدیث کے تحت یہ کہا ہے کہ اس حدیث کا مصداق جماعت اہل حدیث ہے۔ ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی، ان کی حجت غالب رہے گی اور کوئی ان کو نقصان نہ پہنچا سکے گا حتیٰ کہ قیامت قائم ہوجائے گی، بہت سے محدثین کا یہ قول موجود ہے کہ اس جماعت سے مراد جماعت اہل حدیث ہے، مثلاً: یہ قول ایک چوٹی کے محدث یزید بن ہارون کا ہے۔ ایک چوٹی کے دوسرے محدث علی بن مدینی کا ہے۔ علی بن مدینی جن کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں: «مَا اسْتَصْغَرْتُ نَفْسِي إِلَّا عِنْدَ عَلِيِّ ابْنِ الْمَدِينِيِّ» کہ میں نے اپنے آپ کو صرف علی بن مدینی کے سامنے چھوٹا سمجھا۔ وہ حدیث کا ایک سمندر تھے۔ اسی علی بن مدینی کا قول ہے کہ اس جماعت کا مصداق جماعت اہل حدیث ہے۔ اور یہ قول عبداللہ بن مبارک کا ہے۔ بڑی چوٹی کے محدث، امام مالک کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ امام زہری کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اور یہ قول امام احمد بن حنبل کا ہے۔ بلکہ احمد بن حنبل کا فرمان ہے: «إِنْ لَّمْ يَكُونُوا أَهْلَ الْحَدِيثِ فَلَا أَدْرِي مَنْ هُمْ» [1] اگر اس سے مراد جماعت اہل حدیث نہیں ہے تو میں نہیں جانتا کون سی جماعت ہے۔ پھر میں نہیں جانتا کہ اس کا مصداق کون ہے۔ اور یہ قول امام بخاری کا بھی ہے، یعنی یہ چوٹی کے محدثین، اس دین کے اساطین (مضبوط ستون) جن میں سے بعض ایسے ہیں جن کو لاکھوں حدیثیں یاد تھیں۔ لاکھوں حدیثوں کے حافظ تھے۔ چوٹی کے محدثین تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کا مصداق اہل الحدیث ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد محدثین کا گروہ ہے۔ اس سے مراد حفاظ حدیث ہیں، محدثین کرام ہیں۔ چلو مان لیتے ہیں، ٹھیک ہے، اگر اس سے

[1] فتح الباري: 85/1.

مراد محدثین ہیں تو پھر ہم منہج محدثین کے پیروکار ہیں۔ جو اہل الحدیث ہیں، یعنی عام اہل حدیث خواہ وہ آجر ہوں، تاجر ہوں، وہ ملازم ہوں، وہ کچھ بھی ہوں، اپنے آپ کو اہل الحدیث سمجھتا ہے تو وہ اسی منہج کا پیروکار ہے۔ تو اس کا انطباق اگر محدثین پر ہورہا ہے تو اس پر بھی ہورہا ہے جو اس عقیدے، منہج اور فکر کے حامل ہیں۔ تو اللہ کی سنتیں دو نہیں ہوتیں۔ اللہ کی سنت ایک ہے۔ اللہ رب العزت کی جو سنت محدثین کے لیے ہے، وہی ان کے لیے بھی ہے جو اس منہج کے پیروکار ہیں۔ اللہ پاک نے کیا فرمایا؟ ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [1] سابقین اولین کا ذکر کیا، مہاجرین کا، انصار کا جو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے صحابی ہیں۔ جن کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس دین میں سبقت لے جانے والے، سابقین اولین مہاجرین اور انصار، اللہ نے فرمایا کہ میں ان سب سے راضی ہوں اور ان سب سے بھی جو ان کے تابع اور پیروکار ہیں خواہ وہ کسی بھی دور میں آئیں، ان سے بھی راضی ہوں تو یہ رضا صرف سابقین کے لیے نہیں ہے، اولین کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کے لیے بھی ہے جو ان کی اتباع کرنے والے ہیں، وہ کسی بھی دور میں آئیں۔ وہ چاہے سو سال بعد آئیں، آج سے ہزار سال بعد آئیں، آج سے کئی صدیاں بعد آئیں۔ اگر وہ اس منہج کے حاملین ہیں تو اللہ ان سے بھی راضی ہے۔ تو ان احادیث کا مصداق محدثین کا گروہ ہے، اور وہ بھی ہیں جو ان محدثین کے ترجمان ہیں، جو ان کے عقیدے کے حامل ہیں، جو ان کے پیروکار ہیں کیونکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ساری حدیثیں، یہ ساری نصوص جماعت اہل حدیث کی تاریخ ہے۔ محدثین کی گواہیاں موجود ہیں۔

[1] التوبة 9:100.

بہت سے محدثین نے اس حدیث کو بھی جماعت اہل حدیث کا شرف قرار دیا۔ کون سی حدیث؟ «أَوْلَى النَّاسِ بِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلَاةً» [1] قیامت کے دن باعتبار مرتبے اور مقام کے میرے سب سے زیادہ قریب وہ ہوں گے جو مجھ پر زیادہ درود پڑھنے والے ہیں۔ اس کا مصداق بھی محدثین کا گروہ ہے اور اہل الحدیث ہیں جن کی ہر بات اللہ کے پیغمبر کی حدیث سے ہوتی ہے۔ بار بار وہ اللہ کے نبی کا نام لیتے ہیں اور بار بار درود پڑھتے ہیں۔ بار بار درود پڑھتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ کئی لوگ درود کے قائل ہیں، لیکن انھوں نے خود ساختہ درود بنا کر انھیں شرکیہ عبارتوں سے بھر دیا۔ پڑھتے ضرور ہیں، لیکن خود بنا کر، اس میں انحراف داخل کر کے، شرک اور بدعت داخل کر کے وہ بے حیثیت ہو گئے۔ ان کا درود پڑھنا قابل قبول ہی نہیں۔ یہ شرف بھی اہل الحدیث کا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کا زیادہ قرب ان شاء اللہ جماعت اہل حدیث کو حاصل ہوگا۔ جو اللہ کے نبی علیہ الصلاۃ والسلام پر کثرت سے درود پڑھتے ہیں۔ کوئی مجلس، کوئی وعظ کی مجلس اور کوئی درس ایسا نہیں ہوتا جس میں متعدد بار، یعنی بیسیوں بلکہ سیکڑوں بار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ پڑھا ہو۔ مجھے یاد ہے موسیٰ لین (کراچی) میں جب جامع الراشدی مسجد کا افتتاح ہوا تو پہلا جمعہ میں نے پڑھایا اور موضوع تھا نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی محبت اور اطاعت۔ ساتھ فلیٹ میں ایک شخص تھا جو آ کر اہل حدیث ہوا۔ اس نے کہا: مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ اہل الحدیث درود کے منکر ہیں اور میں نے پورا خطبہ سنا اور نوٹ کرتا رہا کہ آپ کتنی بار اللہ کے نبی کا نام لے رہے ہیں اور ہر نام پر درود پڑھ رہے ہیں۔ اور میں نے سو بار سے زیادہ گنا۔ سو سے زیادہ حدیثیں پڑھیں اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

[1] جامع الترمذي، حديث: 484.

کا بار بار نام لیا، درود پڑھا اور بحمد اللہ اس کے اہل حدیث ہونے کا یہی سبب ہو گیا۔ تو یہ شرف بھی اہل الحدیث کا ہے۔ یہ مقام بھی اہل الحدیث کا ہے۔ اس طرح کی بے شمار نصوص ہیں، میں اس موضوع کو ختم کرتا ہوں، اس اختصار کا تقاضا یہی ہے، کیونکہ نصوص بے شمار ہیں جو اہل الحدیث کے شرف پر دلیل ہیں۔

ایک یہ بات کہ جو لفظ یا جو لقب صحیح منہج کا حامل ہے، اس لقب کو چھپانے کا کیا معنی؟ یہ دعوت دین میں رکاوٹ کیسے ہوسکتا ہے؟ رکاوٹ نہیں ہوسکتا۔ یہ تو صداقت کا ترجمان ہے۔ بالخصوص ہمارے ان علاقوں میں اہل حق کی پہچان لفظ اہل حدیث ہے۔ اور میں نے عرض کیا کہ توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ توفیق ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے فیصلے کریں، جس چیز کو چاہیں رکھیں، جس چیز کو چاہیں کاٹیں۔ توفیق ہمارے ہاتھ میں نہیں، توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تو ایک ایسے لفظ کو رکاوٹ قرار دینا جو لفظ صحیح عقیدے، سچی توحید، اللہ کے پیغمبر ﷺ کی سچی غلامی، سچی محبت، سچی اطاعت، سچے منہج، سچے عقیدے کا ترجمان ہے، ایسے لفظ کو دعوت دین میں رکاوٹ سمجھنا، یہ سوچ انتہائی بیمار ہے، انتہائی فقیر، انتہائی قلاش ہے، انتہا کی قابل رحم ہے، جس کی بھی یہ سوچ ہے۔ اس کی فکر بیمار ہے، اس کا ذہن بیمار ہے جو اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔

دوسرا پہلو لفظ اہل حدیث کا تاریخی اور جماعتی تسلسل ہے۔ یہ لقب صحابہ کے دور سے موجود اور قائم ہے۔ اس لقب کو اختیار کرنے کی قرون اولیٰ میں دو ضرورتیں پیش آئیں۔ ایک یہ کہ جب فتنہ شروع ہوا، فتنے سے مراد فتنۂ خوارج ہے۔ جب فتنہ شروع ہوا تو اس فتنے کے نتیجے میں بہت سی گمراہ تحریکیں ظاہر ہوئیں جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے، مسلمان کہتے تھے۔ اور یہ صحابہ کے دور میں شروع ہو چکا تھا۔ میں یہ بتانا

چاہتا ہوں کہ یہ لقب اختیار کیوں کیا گیا اور کس دور میں اختیار کیا گیا؟ دیکھیں ایک قول عامر الشعبی کا۔ یہ عامر الشعبی وہ تابعی ہے جنھیں پانچ سو صحابہ کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ سن ایک سو دس (110ھ) میں ان کا انتقال ہوا۔ اور اکتیس (31ھ) ہجری میں پیدا ہوئے۔ یہ اکتیس ہجری صحابہ کے دور کا شباب ہے۔ پانچ سو صحابہ سے ملاقات اور ان پانچ سو میں سے پچاس کے قریب صحابہ ایسے ہیں جن کے سامنے باقاعدہ انھوں نے درس حدیث لیا۔ ان کا یہ قول تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی نے نقل کیا ہے کہ «لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا حَدَّثْتُ حَدِيثًا إِلَّا بِمَا أَجْمَعَ عَلَيْهِ أَهْلُ الْحَدِيثِ»[1] فرماتے ہیں کہ اگر میں نے پہلے سوچا ہوتا تو میں صرف وہ حدیث روایت کرتا جس پر اہل الحدیث کا اجماع ہے۔ یہ بات کس کی ہے؟ عامر الشعبی کی۔ اور یہ کون ہے؟ یہ وہ تابعی ہے جو پانچ سو صحابہ کی زیارت سے فیض یاب ہوا اور پچاس صحابہ کی شاگردی میں بیٹھے۔ یہ اپنے دور میں نا صرف یہ کہ اہل الحدیث کا ذکر کرتے ہیں بلکہ اہل الحدیث کے اجماع کا ذکر کرتے ہیں۔ بعض صحابہ کے دور میں، تابعین کے دور میں اگر اجماع کی بات کی جائے گی تو اجماع کس کا ہوگا؟ اور اس گروہ کو انھوں نے کیا لقب دیا؟ اس گروہ کو انھوں نے اہل الحدیث کا لقب دیا کہ اس بات پر اہل الحدیث کا اجماع ہے، یعنی اس کا معنی یہ کہ یہ لقب، یہ نام اور یہ لفظ صحابہ کے شباب کے دور میں اور تابعین کے شباب کے دور میں موجود تھا۔ اور یہ وہ دور ہے جس کے بارے میں محمد رسول اللہ کا فرمان ہے: «خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ»[2] کہ سب سے بہترین میرا زمانہ ہے، اس کے بعد میرے بعد کا زمانہ، اس کے بعد اس

[1] تذكرة الحفاظ: 83/1. [2] صحيح البخاري، حديث: 2652.

کے بعد کا دور اور یہ تینوں دور وہ ہیں جن ادوار میں یہ لقب موجود ہے۔ یہ لفظ موجود ہے۔ ناصرف یہ کہ نام کی حد تک بلکہ یہ لفظ اجماع کے ساتھ موجود ہے۔ اجماع کس چیز کا نام ہے؟ اجماع کس چیز پر ہوتا ہے؟ اجماع کس چیز کی علامت ہے۔ تو اس دور میں یہ لقب موجود تھا۔ اس لقب کو اختیار کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ صحیح مسلم کا مقدمہ، اس میں محمد بن سیرین کا ایک قول ذکر کیا۔ محمد بن سیرین، یہ بھی علمائے تابعین میں سے ہیں۔ ان کا شمار بھی کبار تابعین میں ہے۔ تابعین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک ہے کبار تابعین، دوسرے اوساط تابعین اور تیسرے صغار تابعین۔ کبار تابعین، یعنی بڑے تابعین اور اوساط، یعنی درمیانے دور کے اور صغار چھوٹے تابعین۔ کبار تابعین وہ ہیں جن کی زیادہ روایتیں صحابہ کرام سے ہیں۔ اوساط تابعین وہ ہیں جن کی روایتیں پچاس فیصد صحابہ سے ہوں اور پچاس فیصد تابعین سے اور صغار تابعین وہ ہیں جن کی زیادہ روایتیں تابعین سے ہوں اور بہت تھوڑی صحابہ سے ہوں جیسے امام زہری ؒ۔ تو یہ محمد بن سیرین کبار تابعین میں سے شمار ہوتے ہیں۔ ان کی زیادہ روایات اور احادیث صحابہ سے ہیں۔ یہ بہت سے صحابہ کے شاگرد ہیں۔ ان کا قول ہے کہ «لَمْ يَكُونُوا يَسْأَلُونَ عَنِ الْإِسْنَادِ» [1] کہ ایک وقت ایسا تھا کہ ہم، یعنی محدثین، حدیثوں کو پڑھنے والے، پڑھانے والے جب کسی زبان سے قال رسول اللہ ﷺ سنتے تو سند کا سوال نہیں کرتے تھے۔ پاکیزہ فطرتیں تھیں۔ جھوٹ شامل نہیں ہوا تھا۔ منہج حق موجود تھا اور باطل فرقوں کے عقائد ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ جب کوئی قال رسول اللہ ﷺ کہتا، ہمارے دل جھک جاتے اور ہم سند کا سوال نہیں کرتے تھے اور اس پر یقین کر لیتے، اس

[1] مقدمة صحيح مسلم، رقم: 27.

کو مانتے کیونکہ صدق وصداقت ہر طرف تھی، سچائی اور ثقاہت گھر گھر تھی، کوئی کذب، جھوٹ، ضعف، حافظے کی کمزوری اور گمراہ فرقے ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن پھر ایسا وقت آیا کہ فتنہ شروع ہوگیا۔ فتنۂ خوارج اور کچھ گمراہ فرقوں نے جنم لیا۔ کون کون سے؟ ایک خارجی، دوسرا معتزلہ، تیسرا قدریہ، چوتھا رافضہ، پانچواں مرجئہ اور چھٹا جبریہ۔ یہ تمام فرقے پیدا ہوئے۔ یہ گمراہ فرقے پیدا ہوئے اور یہ بھی اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگے۔ اور یہ بھی روایتیں سنتے، روایتیں بیان کرتے۔ اب کوئی تمیز نہیں تھی۔ مسلمان وہ بھی کہلا رہے ہیں، یہ بھی کہلا رہے ہیں، چنانچہ اب ہم پوچھتے کہ تم کون ہو؟ کوئی روایت کرتا ہم سند پوچھتے، سند بیان کرو۔ جب سند سامنے آتی تو پہچان لیتے کہ اس سند میں فلاں اہل بدعت میں سے ہے اور فلاں اہل حدیث میں سے ہے۔ فلاں اہل سنت میں سے ہے۔ دونوں لقب موجود ہیں، یعنی یہ تمیز کرنا بڑا ضروری تھا۔ ضرورت اس امر کی متقاضی ہوگئی کہ اب ان صفوں میں جدائی ہو۔ واضح ہو کہ اپنے آپ کو مسلمان تو سبھی کہہ رہے ہیں، کس قسم کے مسلمان ہیں؟ تم جہمی ہو، قدری ہو یا مرجئہ میں سے ہو یا خوارج میں سے ہو یا روافض میں سے ہو یا اہل حدیث میں سے ہو۔ یہ لقب رائج ہوگیا۔ یہ تمیز اس دور کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ گروہ محدثین اور اس کا لقب صحابہ کے دور شباب میں موجود ہے۔ اور اس کا ایک تاریخی تسلسل ہے۔ یہ نام اور یہ لقب اہل الحدیث کا ہر دور میں ملتا ہے۔ ہر صدی میں اور ہر مقام پر ملتا ہے۔ کوئی دور اس لقب سے خالی نہیں اور کوئی مقام اس سے خالی نہیں۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ایک کتاب ضرور حاصل کریں خطبات راشدیہ۔ اس میں ہمارے شیخ بدیع الدین راشدی ؒ کے تیرہ خطبات ہیں۔ کچھ خطبے پاکستان سے پہلے کے ہیں اور کچھ خطبات پاکستان بننے

کے بعد جو کانفرنس سعید آباد میں منعقد ہوئیں اس میں صدارت کے طور پر آپ نے ارشاد فرمائے۔ ان میں کئی موضوعات ہیں: حقانیت اہل حدیث، صداقت اہل حدیث، قدامت اہل حدیث کہ یہ سب سے پرانا گروہ ہے اور سب سے پرانی جماعت ہے۔ اور تاریخ اہل حدیث، اس کا تسلسل ہر دور میں قائم ہے۔ صحابہ کے دور سے شروع ہوا تابعین، تبع تابعین، قرون اولی کے دور میں اور پھر تیسری ہجری، چوتھی ہجری، پانچویں صدی، چھٹی صدی اور ساتویں صدی، آٹھویں، نویں، دسویں، گیارھویں، بارھویں، تیرویں، چودھویں مکمل ہر دور میں تسلسل موجود ہے۔ اور ہر مقام پر موجود ہے۔ ہمارے شیخ جب یورپ کے دورے سے لوٹے تو ہم نے ایئرپورٹ پر استقبال کیا۔ ہم نے پوچھا: کوئی خاص چیز بتائیں۔ فرمایا کہ میں یورپ میں کوئی بیسیوں علاقوں میں گیا ہوں۔ یورپ بھی گئے، جرمن بھی گئے۔ کینیڈا گئے، امریکہ گئے کوئی بیسیوں سیکڑوں علاقوں میں اور ہر جگہ ہم نے ایک چیز خاص طور پر نوٹ کی۔ وہ یہ تھی کہ ان چار فرقوں: حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی میں سے کسی مقام پر ایک ہے باقی تین نہیں۔ اگر کہیں حنفی ہے وہاں شافعی اور مالکی نہیں، حنبلی نہیں ہے۔ کہیں کوئی حنبلی ہے تو شافعی، حنفی نہیں ہے۔ کہیں پر شافعی ہے وہاں حنفی اور مالکی نہیں ہے، یعنی ان فرقوں میں سے ایک ہے باقی تین نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات ہم نے نوٹ کی کہ اہل الحدیث ہر مقام پر موجود ہیں۔ اہل حدیث ہر مقام پر کیوں موجود ہیں؟ ہاں! رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ یہ سچا دین کہاں کہاں تک جائے گا، وہاں وہاں تک جائے گا جہاں تک سورج کی دھوپ جاتی ہے۔ [1] تو پہنچائے گا کون؟ پہنچائے گا وہی جو سچے دین کا حامل ہے۔ اگر حنفیت سچی ہے تو ہر مقام

[1] صحیح مسلم، حدیث:2889.

پر موجود کیوں نہیں؟ شافعیت سچی ہے تو ہر مقام پر موجود کیوں نہیں؟ مالکیت سچی ہے تو ہر مقام پر موجود کیوں نہیں؟ اور جو جماعت ہر مقام پر موجود ہے، کیوں ہے؟ چونکہ میرے پیغمبر کا فرمان ہے: جہاں جہاں تک سورج کی کرنیں ہیں، وہاں وہاں یہ دین جائے گا۔ کیسے جائے گا؟ جنوں کے ذریعے؟ ملائکہ کے ذریعے؟ نہیں، اس دین کو پہنچانے والے اللہ کے بندے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنی خلافت دی۔ یہ پہنچائیں گے۔ تو ہر مقام پر موجود ہوں گے تو پہنچائیں گے۔ لہٰذا کوئی صدی، کوئی زمانہ اور کوئی مقام جماعت اہل حدیث کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ آؤ ایک اور حدیث جس میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے بحمد اللہ صراحت کے ساتھ مہر لگادی ہے کہ سچی جماعت کون سی ہے۔ وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح بخاری میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قبیلہ بنوتمیم سے مجھے نفرت تھی، لیکن جب نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے تین باتیں سنیں تو مجھے اس سے محبت ہوگئی۔ ایک بات میں نے یہ سنی کہ اللہ کے نبی ﷺ نے بنوتمیم کو اپنی قوم کہا، اپنی قوم۔ بنوتمیم قبیلے کا صدقہ آیا۔ اللہ کے نبی نے پوچھا: یہ صدقہ کہاں سے آیا؟ بتایا گیا: بنوتمیم نے بھیجا ہے تو فرمایا کہ «هٰذِهِ صَدَقَاتُ قَوْمٍ أَوْ قَوْمِي» یہ میری اپنی قوم کا صدقہ ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے بنوتمیم کو اپنی قوم قرار دیا۔ فرمایا: جب میں نے یہ بات سنی، مجھے اس قوم سے محبت ہوگئی اور ایک دفعہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے دیکھا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک لونڈی ہے۔ جب آپ نے تعارف حاصل کیا تو فرمایا: عائشہ! اس کو آزاد کردو، یہ لونڈی اولاد اسماعیل سے ہے۔ وہ لونڈی کون تھی؟ یہ لونڈی بنوتمیم کی تھی۔ تو گویا بنوتمیم اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ حدیث سن کر مجھے اس قوم سے اور محبت ہوگئی۔ اور تیسری بات یہ سنی: «هُمْ أَشَدُّ أُمَّتِي عَلَى الدَّجَّالِ» [1]

[1] صحیح البخاري، حدیث:2543.

بنوتمیم میری امت کا وہ گروہ ہے جو دجال کے مقابلے میں سب سے سخت ہوگا۔ جب دجال آئے گا سب سے زیادہ سخت مقابلہ بنوتمیم کریں گے، دجال کو شکست دیں گے، دجال پر بھاری پڑ جائیں گے۔ یہ بنوتمیم کی منقبت ہے۔ یہ اس کی فضیلت ہے۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ بنوتمیم اس وقت بھی تھی اور قیامت تک رہے گی۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ بنوتمیم دجال کا مقابلہ کریں گے۔ یعنی آج بھی ہوں گے۔ کوئی دور ان سے خالی نہیں ہوگا۔ اس وقت بھی تھے، ہر دور میں رہیں گے۔ قیامت تک رہیں گے حتیٰ کہ دجال کا مقابلہ کریں گے۔ معنی کوئی زمانہ بنوتمیم سے خالی نہیں ہوگا۔ اور یہ حق جماعت ہے۔ جب ہم نے یہ حدیث پڑھی تو ایک سوچ دماغ میں آئی کہ بنوتمیم یقیناً آج بھی ہیں۔ دیکھیں ان کا کیا منہج ہے؟ ان کا کیا عقیدہ ہے؟ ان کی کیا فکر اور کیا سوچ ہے؟ آخر پیغمبر علیہ السلام کی یہ معمولی حدیث نہیں ہے۔ یہ حدیث اللہ پاک کے فرمان کے مطابق کہ ہم گاہے گاہے تمھیں نشانیاں دکھائیں گے۔ یہ حدیث اللہ کی ایک نشانی ہے۔ اگر کتاب وسنت تم پر اثرانداز نہیں ہیں، اس حدیث سے وہ سمجھ لیں۔ یہ اللہ کی ایک نشانی ہے۔ اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ﴾ نشانیاں گاہے گاہے تمھیں دکھاتے رہیں گے۔ یہ مذہب اللہ کی نشانی ہے۔ ہم نے بنوتمیم تلاش کیے، دیکھے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ جو بھی تمیمی ہم کو ملے، وہ سب کے سب اہل حدیث تھے۔ ان کا عقیدہ، منہج، فکر، سوچ، ان کا عمل وہی تھا جو جماعت اہل حدیث کا تھا۔ تو یہ ساری نصوص کس بات کی علامت ہیں؟ یہ جماعت اہل حدیث کی فضیلت، اس کی حقانیت اور صداقت کا معیار ہیں۔ ہر مقام پر یہ جماعت موجود ہے۔ اس کا تسلسل تاریخ سے ثابت ہے۔ آپ جو بھی دور اٹھائیں، ہر دور میں اس

جماعت کا آپ کو وجود ملے گا۔ اللہ اکبر! امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک قول ہے، سبحان اللہ۔ امیرالمومنین فی الحدیث امام بخاری کا ایک قول ہے۔ فرماتے ہیں: «كَتَبْتُ عَنْ أَلْفٍ وَّثَمَانِينَ نَفْسًا لَّيْسَ مِنْهُمْ إِلَّا صَاحِبُ الْحَدِيثِ وَلَمْ أَكْتُبْ إِلَّا مَنْ قَالَ: الْإِيمَانُ قَوْلٌ وَّ عَمَلٌ» [1] امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار اسی اساتذہ سے حدیث لی ہے۔ حدیث میں میرے ایک ہزار اسی اساتذہ ہیں۔ محدثین جن سے میں نے حدیث لکھی ہے۔ اور فرمایا کہ وہ سب کے سب اہل حدیث تھے اور فرمایا کہ میں نے صرف اس محدث سے حدیث لی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے۔ ذرا اس قول کی گہرائی میں جاؤ کہ میں نے صرف اس محدث سے حدیث لی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ایمان قول اور عمل کا نام ہے۔ اب کتابیں اٹھاؤ کہ ایمان کو قول وعمل قرار دینے والے کون ہیں؟ ایمان کی تعریف میں اس دور میں اختلاف تھا۔ پانچ قول معروف ہیں۔ جو اہل الحدیث کا قول علماء نے بیان کیا وہ یہ ہے جو اہل الحدیث کی کتابوں میں اسی نام سے منسوب ہے۔ اہل الحدیث کا مذہب یہ تھا کہ ایمان نام ہے زبان کے اقرار کا، دل کی تصدیق کا اور اعضاء کے عمل کا۔ یہ ایمان کی تعریف کن کے نزدیک ہے؟ اہل الحدیث کے نزدیک۔ امام بخاری فرماتے ہیں: میں نے حدیث صرف اس سے لی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ایمان زبان کے اقرار، دل کی تصدیق اور اعضاء کے عمل کا نام ہے۔ میں نے صرف اس سے حدیث لی ہے اور وہ ایک ہزار اسی ہیں، معنی یہ کہ امام بخاری نے ایک ہزار اسی اساتذہ سے حدیث لی اور وہ سب کے سب اہل الحدیث تھے۔ چونکہ ان کا عقیدہ جو امام بخاری نے بیان فرمایا، وہ عقیدہ

[1] سير أعلام النبلاء: 12/395.

اہل الحدیث کا ہے۔ باقی چار قول اس سے مختلف ہیں۔ ایک قول کرامیہ کا ہے۔ کرامیہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف دل کی تصدیق کا نام ہے۔ بندہ دل سے اگر جانتا ہے کہ اللہ ایک ہے بس کافی ہے، وہ کامیاب ہوگیا۔ وہ زبان سے اقرار کرے یا نہ کرے، نماز پڑھے یا نہ پڑھے، بس کافی ہے۔ گناہ کرتا رہے کوئی اثر نہیں ہوگا۔ یہ کرامیہ کا قول ہے۔ دوسرا قول مرجئہ کا ہے۔ مرجئہ کہتے ہیں کہ نہیں، دل کی تصدیق کے ساتھ زبان کا اقرار بھی ضروری ہے، باقی عمل ضروری نہیں۔ وہ عمل کو ایمان کی تعریف سے خارج کرتے ہیں۔ آج احناف کا قول بھی یہی ہے اسی قول کی بنا پر۔ یہ دوسرا ہے۔ تیسرا قول یہ تھا کہ عمل ایمان میں داخل ہے اور ایسا داخل ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گناہ کرے گا تو ایمان سے خارج ہوجائے گا اور کفر میں داخل ہوجائے گا۔ اور پانچواں قول معتزلہ کا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک گناہ کرنے والا ایمان سے خارج تو ہوجائے گا لیکن کفر میں داخل نہیں ہوگا۔ انھوں نے ایک نئی منزل تیار کی جو ایمان اور کفر کے درمیان تھی کہ ایمان سے نکل جائے گا لیکن کفر میں داخل نہیں ہوگا۔ بلکہ بیچ میں لٹک جائے گا اور معلق رہے گا۔ اہل الحدیث کی تعریف یہ تھی کہ ایمان تین چیزوں کا نام ہے: زبان کے اقرار کا اور دل کی تصدیق کا جو ضروری ہے اور ساتھ ساتھ اعضاء کے عمل کا۔ یہ نماز ہے، روزہ ہے، حج ہے، عمرہ ہے لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے کوئی کام نہ کرسکا، وہ فاسق و فاجر ہے۔ اس کی اصلاح کریں گے، اس کو دعوت دیں گے لیکن وہ ایمان سے خارج نہیں۔ یہ فکرِ اہل حدیث ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ایک ہزار اسی اساتذہ سے میں نے حدیث لی، ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ ایمان قول، تصدیق اور عمل کا نام ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوا کہ ایک ہزار اسی صرف وہ اساتذہ، وہ محدثین، وہ

اہل الحدیث ہیں جو امام بخاری کے دور میں تھے۔ یہ علماء اور محدثین اگر میں آج آپ میں سے کسی سے پوچھوں کہ دنیا بھر میں جو علمائے اہل حدیث اور ربانیین ہیں ذرا ان کے نام گن کے بتاؤ، پوری دنیا میں ان کے نام گن کر بتاؤ، میرا خیال یہ ہے کہ آپ پوری دنیا میں چھ سات آٹھ یا دس بارہ گن سکیں گے۔ اللہ اکبر۔ یہ کیسا دور تھا کہ صرف امام بخاری اپنے دور میں ایک ہزار اسی اہل الحدیث علماء سے سماعِ حدیث فرماتے ہیں۔ کیسا دور تھا! آج پوری دنیا میں آپ دس بارہ ناموں سے زیادہ نہیں گن سکتے۔ بیس پچیس نام گن لیں گے۔ جو اعیان (اور کبار) ہیں، علمائے ربانیین ہیں۔ وہ نہیں جو خطباء ہیں بقول ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہ ایک وقت آئے گا خطباء بہت زیادہ ہوں گے علماء بہت تھوڑے ہوں گے۔[1] ان کی بات نہیں کر رہا۔ علمائے ربانیین شمار کرو، آپ ان کو انگلیوں کے کچھ پوروں پر شمار کرسکیں گے۔ تو یہ کیسا زریں دور ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ایک ہزار اسی اہل الحدیث علماء سے میں نے حدیث لی ہے، ان سے حدیث لکھی ہے۔ اور آگے چلو! امام بخاری سے صحیح بخاری پڑھنے والے ساٹھ ہزار محدثین۔ یہ ایک ہی دور ہے، ایک ہی دور میں امام بخاری کے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار اسی اور امام بخاری کے شاگرد ساٹھ ہزار محدثین، سارے کے سارے اہل حدیث۔ یہ کتنا تاریخی دور ہے۔ یہ اس جماعت کی تاریخ ہے اور یہ تاریخ اپنے پورے تسلسل کے ساتھ ثابت ہے۔ کوئی دور خالی نہیں اور کوئی مقام خالی نہیں۔ ہر دور میں یہ جماعت موجود ہے اور ہر مقام پر یہ جماعت موجود ہے تا کہ سچا منہج، سچا عقیدہ، دعوتِ توحید، اللہ کے پیغمبر ﷺ کی پیاری سنت دنیا بھر میں پہنچتی رہے اور محبت کی دعوت جاتی رہے۔ تو اگر

[1] سنن الدارمي: 64/1، و المستدرك للحاكم: 51/4.

آپ ہمارے شیخ کی کتاب کا مطالعہ کریں گے تو قدامت اہل حدیث کے تعلق سے اور تاریخی تسلسل کے تعلق سے یہ بات آپ پر واضح ہوگی۔ تو پھر یہ لقب وہ لقب ہے جو آج کے اس دور میں بحمد اللہ ہم نے اختیار کیا، جو صحابہ کے دور سے آیا، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور خاص طور پر قرون اولیٰ جن زمانوں کو اللہ کے پیغمبر ﷺ نے سب سے بہترین دور اور بہترین زمانہ قرار دیا، ان سے آیا۔ یہ ہوگئی دوسری بات۔ ہم نے دو پہلو بیان کیے، ایک یہ کہ فضائل اہل حدیث اور دوسرا اس لقب کا تاریخی تسلسل اور اس لقب کی قدامت اور قرون خیر میں اس لقب کا استعمال، یہ سب موجود اور ثابت ہے۔ تو آج جتنے بھی القاب موجود ہیں، سب سے زیادہ ثقہ لقب یہی ہے۔ لوگوں نے اب اپنے مختلف نام رکھ لیے، ان کی تو کوئی تاریخ ہی نہیں۔ ان ناموں کے وہ خود ہی بانی ہیں، خود ہی موجد ہیں اور خود ہی اس کے ترجمان۔ جو میرا لقب ہے، میری جماعت کا لقب ہے اس کی تاریخی حیثیت ہے۔ اس کے گواہ اور شاہد عدل علماء اور محدثین ہیں۔ وہ محدثین جو امت کے اساطین ہیں۔ اور یہ شہادتیں سب نے دیں۔
امام محمد بن حسن الشیبانی جو حنفی مذہب کے بہت بڑے ستون ہیں، وہ کہا کرتے تھے: امام زہری مدینہ کے اہل حدیث میں سے سب سے بڑے محدث ہیں۔ یہ اہل حدیث کا لقب وہ بھی جانتے ہیں۔ یہاں یہ بات نہ کہو کہ اس سے مراد محدثین ہیں۔ اگر کہو گے بھی تو کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ وہ محدثین تھے اور بحمد اللہ ہم ان کے جوتے اٹھانے والے ہیں۔ ان کے منہج کے حامل ہیں۔ فرق کوئی نہیں۔ جو عقیدہ، منہج اور جو سنت کی معرفت اور جو صحیح دین، اللہ نے ان کو دیا ہم اسی کے حاملین، اسی کے ترجمان ہیں، کوئی فرق نہیں۔ اللہ رب العزت نے جو مقام ان سابقین اولین کو دیا، وہی ان کے

پیروکاروں کا بھی ہے، اللہ کی رضا اور اللہ کی محبت کا۔ اس کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ اور تاریخ کے تسلسل سے یہ ثابت ہے۔ مگر خاص طور پر چونکہ یہ لقب برصغیر پاک و ہند میں ایک صداقت اور حقانیت کی پہچان ہے۔ اہل الحدیث جب نام لیا جائے گا تو کیا سامنے آئے گا؟ سامنے یہ آئے گا کہ یہ موحدین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی توحید کے سچے حاملین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے عقیدہ اسماء و صفات میں کسی قسم کا الحاد نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی توحید پختہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شرک سے بیزار ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ ہے، دوسرے میں اللہ کے پیغمبر ﷺ کی سنت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نبی علیہ السلام سے سچی محبت کرنے والے ہیں، سچی اطاعت کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا منہج، جن کا عقیدہ اور تمام چیزیں کتاب و سنت کے مطابق ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں اگر کسی وقت ان کو بتا دیا جائے کہ تمھارا فلاں عمل اللہ کے پیغمبر کی فلاں حدیث کے خلاف ہے تو پھر یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس بارے میں شیخ کا کیا قول ہے، برادری کی کیا بات ہے، ماں باپ کا کیا عمل ہے۔ وہ اس کو چھوڑ دیں گے اور کتاب و سنت کی بات کو قبول کرلیں گے۔ حق کو قبول کرلیں گے۔ یہ سچے منہج کے حاملین ہیں۔ یہ ہمارا تعارف ہے اور دنیا جانتی ہے۔ تو یہ دو پہلو ہوگئے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات امر واقع ایک امر کو ثابت کرتا ہے کہ واقعتاً ایک چیز نظر آرہی ہے اس کو دیکھو اور فیصلہ کرو، یعنی اگر آپ کہتے ہیں کہ اہل حدیث کا لفظ دعوت دین میں رکاوٹ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو امر واقع ہے وہ آپ کے اس دعوے کے خلاف ہے۔ وہ کیسے؟ آج کی اس تاریخ جدید میں جو امر واقع ہمارے سامنے ہمارے دور میں ہے چونکہ امر واقع وہ ہوتا ہے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

میں اپنے اس دور کی بات کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے، جن علماء نے اہل الحدیث کے لقب کو اختیار کرکے قرآن و حدیث کا نام لے کر دعوت دین پیش کی، وہ کس قدر کامیاب ہوئے اور جنھوں نے اس لقب کو چھپا کر گول مول بات کرنے کی کوشش کی وہ کہاں تک کامیاب ہوئے؟ میں پہلی مثال دیتا ہوں شیخ العرب والعجم، توحید کی ننگی تلوار علامہ بدیع الدین شاہ راشدی ؒ کی۔ انھوں نے ہر مقام پر لفظ ''اہل حدیث'' کی بات کی اور لقب اہل حدیث کی بات کی۔ جب سندھ میں دعوت کا آغاز کیا تو پورے سندھ میں بس ایک مسجد اہل حدیث کی تھی۔ اور پھر ہر جگہ پہنچ کر، کونے کونے میں جا کر اس دعوت کو پیش کیا۔ جس وقت دنیا سے گئے تو پورے سندھ میں سات سو پچاس مساجد بن چکی تھیں۔ ہر مسجد بھرپور نظم کے ساتھ باقاعدہ ایک جماعت تھی جو کتاب وسنت کے حاملین تھے۔ یہ ایک امر واقع ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی گواہی میں بھی دیتا ہوں، آپ بھی دیں گے۔ کوئی اس امر واقع کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ یہ جو میں نے اقوال پیش کیے، آپ اس میں کچھ بات کرسکتے ہیں۔ لیکن امر واقع جس چیز کی گواہی دے رہا ہے، اس کی تردید کون کرے گا؟ ہے کوئی تردید کرنے والا؟ یہ سات سو مساجد جو بحمد اللہ اب تک نو سو کے قریب پہنچ چکی ہیں کوئی اس کا انکار کرنے والا ہے؟ ہر جگہ اہل حدیث اور دعوت اہل حدیث موجود ہے۔ ایک ایک گاؤں میں، ایک ایک گوٹھ میں، ایک ایک بستی میں۔ وہ وقت بھی دیکھا جب لوگ پتھر مارتے، دھتکارتے اور کوشش کرتے بدیع الدین کو اس گاؤں میں نہیں آنے دینا۔ اور نکال دیتے۔ انکار کرتے۔ وہ وقت بھی دیکھا جب شاہ صاحب اور آپ کے جاں نثار ساتھی اسلحے سے مسلح ہوکر دعوت دینے جاتے۔ اور یہ جو سندھ میں پیری مریدی کا نظام ہے، اس نظام

سے پنجہ آزمائی کی، اس نظام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، سچی توحید پیش کی اور آج سندھ کا ایک ایک ذرہ اور تھر کی ریت کا ایک ایک ذرہ گواہی دے گا کہ بدیع الدین نے اللہ کی توحید پیش کی اور بدیع الدین نے منہج اہل حدیث کو پیش کیا۔ اس لقب کے حاملین آج پورے سندھ میں نہ صرف یہ کہ پھیلے ہوئے ہیں بلکہ چھائے ہوئے ہیں۔ ایسے کئی گوٹھ میں جانتا ہوں جہاں صرف اہل حدیث ہیں۔ پورے تھر میں جاکر دیکھو، آپ کو دو جماعتیں ملیں گی یا ہندو ملیں گے یا اہل حدیث ملیں گے۔ یہ کس کی دعوت کا اثر ہے؟ اگر یہ لقب رکاوٹ ہے تو یہ جماعت کہاں بنی؟ یہ نو سو مساجد کہاں سے آگئیں؟ تو تمھارا امر واقع اس چیز کی مخالفت کررہا ہے۔ اس چیز کا انکار کررہا ہے۔

دوسری گواہی، یہ سرزمین بہاولپور جہاں ایک شخصیت پیدا ہوئی حافظ عبداللہ بہاولپوری ؒ جنھوں نے اس لقب اور اس لفظ کو خوب ابھارا اور خوب نمایاں کیا۔ اور اس کی اساس پر دعوت پیش کی۔ جماعت اہل حدیث بہاولپور آج بھی موجود ہے۔ اور جب یہ نام خال خال ہوتا تھا، لوگ اس نام سے واقف نہیں تھے بقول یونس بن عبید ؒ کے کہ سب سے اجنبی اہل حدیث ہیں اور تھے۔ لیکن اس لقب کے ساتھ، اس وصف کے ساتھ اس سرزمین پر کام کیا، آج آپ کو بہاولپور میں چپے چپے پر اہل حدیث ملیں گے۔ اور سچے منہج کے حاملین، سچا عقیدہ، توحید اور کھری توحید ملے گی۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا سچا دین پیش کرنے والے۔ یہ اس لقب کو اختیار کرنے کی برکت ہے۔ یہ امر واقع تمھارے اس موقف کی تردید کررہا ہے۔ پھر رکاوٹ کہاں ہے؟ یہاں تو جماعتیں بن رہی ہیں اور اللہ کے فضل وکرم سے دعوت پھیل رہی ہے۔ مجھے شیخ سلطان محمود ؒ کے الفاظ یاد ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ فرماتے ہیں کہ جلالپور میں آکر ادارہ قائم کیا، کچھ طلبہ کو

جمع کیا اور درس حدیث شروع کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ ایک وقت تھا جلالپور سے نکلتے اور
شجاع آباد تک آتے اور کوئی شخص ہمیں پانی کا ایک گھونٹ پلانے کے لیے تیار نہ ہوتا۔
ہمیں دھتکارتے کہ یہ وہابی جا رہا ہے۔ یہ اہل حدیث جا رہا ہے۔ ایک پانی کا گھونٹ
ہم کو میسر نہ آتا۔ اور آج وہ وقت ہے کہ اگر اپنے ساتھی کی خواہش پر میں صرف ان کو
سلام کرتا ہوا اور صرف ان سے پانی کا ایک گلاس پیتا ہوا آگے بڑھوں تو جلالپور سے
شجاع آباد کا سفر چھ ماہ میں پورا ہو۔ یہ لوگ کہاں سے آ گئے؟ یہ منہج اہل حدیث کے
سچے حاملین تھے۔ تم کہتے ہو رکاوٹ ہے۔ تمھارے اس مدعا کی تردید امر واقع کر رہا
ہے۔ آپ اس امر واقع کے تجزیے کو لے کر دیکھیں۔ یہ پنجاب میں جماعت کہاں سے
آئی؟ علماء نے جو ہمارے مشائخ ہیں، بزرگ ہیں، اسی منہج کے ساتھ کام کیا۔ اور ایک
وقت تھا کہ مساجد خال خال ملتی تھیں۔ آج گوجرانوالہ کے چھوٹے سے شہر میں تقریباً
ایک ہزار سے زائد مساجد موجود ہیں۔ فیصل آباد میں بھی یہی تعداد ہے۔ لاہور میں
اس سے زیادہ تعداد ہے۔ سیالکوٹ میں یہی تعداد ہے۔ یہ مساجد کہاں سے آ گئیں؟
یہ جماعت کہاں سے آ گئی؟ یہ لوگ کہاں سے آ گئے؟ اور وہاں کوئی کسی قسم کا اکراہ نہیں
ہے۔ یہ سچے نام اور لقب کے ساتھ بحمد اللہ کام ہو رہا ہے اور بھرپور کام ہو رہا ہے۔ علماء
پیدا ہو رہے ہیں۔ مدارس بڑھتے جا رہے ہیں۔ مساجد تعمیر ہو رہی ہیں۔ دعوت پھیلتی
جا رہی ہے۔ صوبہ خیبر پختونخوا میں کبھی صرف ایک نام تھا شیخ عبدالعزیز نورستانی حفظہ اللہ کا،
اللہ ان کی حفاظت فرمائے۔ وہ یہاں آئے، اہل حدیث مدارس میں دین پڑھا، علم حاصل
کیا اور دعوت اہل حدیث قبول کی اور اس کھری دعوت کو لے کر اسی لقب اور لفظ کے
ساتھ خیبر پختونخواہ میں کام شروع کیا۔ آج وہاں بھی ہزاروں مساجد بن چکی ہیں۔ اور

اس منہج کا باقاعدہ نام ہے۔ افغانستان میں اسی طریق سے، اسی توسل سے یہ نام پہنچ چکا
تو یہ امر واقع یہاں پاکستان میں، ہندوستان میں، بنگلہ دیش میں ہم نے بڑے بڑے
اجتماعات دیکھے ہیں۔ اہل الحدیث کا لقب اختیار کرنے والے یہ لوگ کہاں سے آئے؟
دعوت کیسے پھیلی؟ یہ گول مول دعوت کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہاں گول مول نام بہت ہیں۔
کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اس کا نام نہ لو۔ بات کرو، دعوت دو بس گول مول تاکہ
جہاں پھرنے کی، سرکنے کی نوبت آ جائے وہاں سرکنا آسان ہو کہ ہم تو اہل حدیث نہیں
ہیں۔ یہ لوگ مفاد پرست ہیں۔ یہ لوگ تاجرانہ ذہن کے حامل ہیں۔ یہ لوگ دنیادار
ہیں۔ ان کے مناہج مشکوک ہیں اور جو کھرے ہیں اس کھرے منہج کے ساتھ کام کرنے
والے ہیں۔ اور یہ یاد رکھو! کام کی برکت اور کامیابی تمھارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔
یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم وفاداری کرو اللہ کے دین کے ساتھ اور منہج سلف صالحین
کے ساتھ، پیغمبر علیہ السلام کی سنت کے ساتھ، کامیابی دینا یا نہ دینا یہ اللہ کے اختیار میں ہے،
اللہ کی مرضی میں ہے۔ یہ لفظ اللہ چاہے تو رکاوٹ ہو سکتا ہے۔ اور اگر اللہ چاہے تو
نہیں ہو سکتا۔ نہ ماننے والے اللہ کا نام بھی نہیں مانتے، نہ ماننے والے اسلام کا نام بھی
نہیں مانتے۔ تو پھر کیا مصلحت کے تحت اللہ کا نام چھوڑ دو گے۔ اسلام کا نام چھوڑ دو
گے۔ آج اہل یورپ تمھارے اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ روایتی مسلمان کو نہیں مانتے۔
اسے قبول نہیں کرتے۔ بوسنیا میں مسلمان کیسے ہیں؟ صرف نام کے ہیں۔ نہ ان کو
اذان آتی ہے، نہ ان کو کلمہ آتا ہے، نہ ان کو نماز آتی ہے، نہ ان کو قرآن آتا ہے، صرف
کیا ہے؟ مسلمان ہیں۔ بس اتنا ہے باقی کچھ نہیں۔ ان کو بھی انھوں نے تہ تیغ کیا۔ وہ
تو روایتی نام کو بھی نہیں مانتے جو اسلام کے سچے حاملین ہیں، ان کو کیسے مانیں گے۔ پھر

اسلام کا نام بھی نکال دو، مصلحت ہے دعوت کی۔

میرے دوستو اور بھائیو! اس لقب کی ایک تاریخ ہے۔ اس لقب کی ایک صداقت ہے۔ ایک حقانیت ہے۔ اس کا ایک تسلسل ہے۔ اور یہ سلسلۂ تاریخ چلتا آرہا ہے۔ صحابہ کے دور سے لے کر آج کے اس دور تک اور ان شاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا۔ ان شاء اللہ اس کھرے منہج کے ساتھ ان کھرے لوگوں نے دعوت کا کام کرنا ہے توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہی جماعت ہے۔ آخر میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی ایک حدیث سنا کر بات ختم کرتا ہوں جس میں آپ نے تہتر فرقوں کا ذکر کیا۔ اور آخری بات ارشاد فرمائی کہ سوائے ایک کے سب جہنم میں جائیں گے۔ پوچھا گیا: وہ ایک کون ہے؟ آپ کے دو طرح کے جواب منقول ہیں۔ ایک یہ کہ «هُمُ الْجَمَاعَةُ» [1] وہ ایک جماعت جو جنت میں جائے گی وہ الجماعۃ ہے۔ وہ کیا ہے؟ الجماعۃ ہے۔ وہ جماعت ہے۔ دوسرا جواب کیا ہے؟ «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِي» [2] یہ وہ لوگ ہیں جو اس چیز پر قائم ہوں گے جس پر آج میں اور میرے صحابہ ہیں۔ معنی کیا ہوا کہ جو لوگ اس منہج پر قائم ہوں جس پر اللہ کے پیغمبر تھے اور صحابہ کرام تھے وہی جماعت ہیں، باقی کوئی جماعت نہیں۔ جماعت کون ہیں؟ وہ لوگ جو اس چیز پر قائم ہوں جس پر اللہ کے پیغمبر تھے اور صحابہ تھے۔ اس پر آج کون قائم ہے؟ صرف اہل الحدیث، باقی کوئی نہیں۔ باقی ساری جماعتیں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ آپ ان کے مناہج دیکھیں، آپ ان کی تاریخ دیکھیں، آپ ان کے عقائد دیکھیں۔ ہر جگہ آپ کو جھول نظر آئے گا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے منہج، دین اور عمل پر صرف اہل الحدیث قائم ہیں، صرف اہل الحدیث

[1] سلسلة الأحاديث الصحيحة: 21/3، و سنن ابن ماجه، حديث: 3992، و 3993، و سنن أبي داود، حديث: 4597. [2] جامع الترمذي، حديث: 2641، و مسند أحمد: 332/2.

قائم ہیں۔ اور اللہ کے پیغمبر کے فرمان کے مطابق وہ الجماعۃ ہیں۔ تو یہی جماعت ہے جو صحابہ کے دور سے چلی آرہی ہے۔ آج بھی موجود اور قائم ہے اور قیامت تک یہ منہج اور یہ جماعت ان شاء اللہ قائم رہے گی۔ باقی میری کوئی کمزوری ہو، میرے ساتھی کی کوئی کمزوری ہو، کسی اور شیخ کی کمزوری ہو وہ اس کی ذاتی کمزوری ہے۔ منہج اہل حدیث کی کمزوری نہیں۔ ہماری کمزوری ہمیں بتائی جائے گی، ہم اس کو تسلیم کریں گے، اس سے رجوع کریں گے، لیکن منہج اہل حدیث، فکر اہل حدیث، مسلک اہلحدیث یہ روز روشن کی طرح سچا ہے، صادق ہے، برحق ہے اور بالکل واضح ہے جس میں کوئی جھول نہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمالے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو سچے دین پر قائم رکھے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے، عقیدے کی اصلاح کی اور عمل کے منہج کی اصلاح کی توفیق عطا فرمادے۔

«وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ»

تقلید کے اثبات میں دیے جانے والے دلائل کا علمی محاسبہ

تقلید کے اثبات میں دیے جانے والے دلائل کا علمی محاسبہ

خطبہ مسنونہ:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ۝﴾ [1]

محترم سامعین حضرات! آج کا موضوع آپ نے سن لیا کہ تقلید کے اثبات میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان کا علمی محاسبہ۔ میں تھوڑا سا یہاں اختلاف کروں گا، تقلید کے اثبات میں دلائل کا لفظ بنتا نہیں ہے۔ ہاں شبہات آپ کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے بنظر غائر ان دلائل کو دیکھا ہے، ان کی حقیقت کو دیکھا ہے۔ تو ان کو دلائل نہیں کہنا چاہیے، ہاں ان کو شبہات کہا جاسکتا ہے کہ ان نصوص سے کچھ لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ شاید یہاں سے تقلید ثابت ہورہی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے جس قدر گہرائی سے ان شبہات کو دیکھا یا ان کے دلائل کو دیکھا تو مجھے وہ تقلید کے نہیں بلکہ ترک تقلید کے دلائل معلوم ہوئے، یعنی جو ثبوت تقلید کے جواز کے لیے پیش کیے جارہے ہیں ان پر جتنا غور کیا تو وہ سارے کے سارے تقلید کے جواز کے بجائے تقلید کی تردید اور اس

[1] محمد 47:2.

کے ترک کے دلائل ہیں۔ اور یہ بھی میں نے محسوس کیا کہ تقلید کا معاملہ سارے کا سارا تناقضات پر قائم ہے۔ ایک چیز دوسری کے خلاف ہے۔ باہم تناقض ہے، تضاد ہے، تعارض ہے۔ اور اللہ پاک کا فرمان: ﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ [1] اگر یہ دین اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں لوگ بڑا اختلاف پاتے۔ چونکہ یہ شریعت اللہ کی طرف سے ہے اس لیے تناقض، تعارض اور اختلاف سے پاک ہے، مثلاً: ایک تناقض یہ ہے کہ آج ائمہ میں سے جس جس امام کی تقلید ہورہی ہے، اس اس امام نے خود یہ کہا ہے کہ ہماری تقلید نہ کرو۔ اپنی تقلید سے روکا ہے۔ اب ان کی تقلید کا حق تو یہی ہے کہ ان کی اس بات کو مان لو اور تقلید نہ کرو۔ یہاں تواضع نہیں ہے کہ انھوں نے برسبیل تواضع روکا ہو۔ نہیں، یہ حقیقت کا انکشاف ہے کہ کوئی تقلید کے لائق نہیں۔ اتباع ہے رسول اللہ ﷺ کی، اطاعت ہے کتاب و سنت کی، اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی۔ تو یہ تناقض ہے۔ جس جس امام کی تقلید ہورہی ہے وہ خود روک کر، حجت قائم کر کے چلا گیا۔ مثلاً: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، وہ اپنے شاگرد قاضی ابو یوسف سے فرماتے ہیں، انھوں نے محسوس کیا کہ جو وہ درس دے رہے ہیں، وہ ہر بات لکھ رہے ہیں۔ کہا کہ «وَيْحَكَ يَا يَعْقُوْبُ! لَا تَكْتُبْ كُلَّ مَاتَسْمَعُ مِنِّي» اے یعقوب! ابو یوسف کا نام ہے، افسوس! تم میری تمام باتیں نہ لکھا کرو۔ «فَإِنِّي قَدْ أَرَى الرَّأْيَ الْيَوْمَ وَ أَتْرُكُهُ غَدًا وَ أَرَى الرَّأْيَ غَدًا وَ أَتْرُكُهُ بَعْدَ غَدٍ» آج کوئی بات کہتا ہوں اور کل رجوع کرلیتا ہوں۔ اور کل کوئی بات کہتا ہوں تو پرسوں اس سے رجوع کرلیتا ہوں۔ [2] انسان خطا کا پتلا ہے۔

[1] النسآء 4:82. [2] تاريخ ابن معين (رواية الدوري):3/504.

ان کو روکا، منع کیا۔ اور جہاں اطاعت متعین ہوتی ہے وہاں اس طرح روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی احادیث لکھا کرتے تھے۔ صحابہ نے روکا، کیوں لکھتے ہو؟ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کبھی حالت رضا میں ہوتے ہیں، کبھی حالت غضب میں ہوتے ہیں۔ اور تم ہر بات لکھ لیتے ہو۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ «فَأَمْسَكْتُ عَنِ الْكِتَابِ» میں نے قلم بند کرلیا، لکھنا چھوڑ دیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد سوچا کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے پوچھوں کہ میں نے ایسا صحیح کیا یا غلط؟ سوال کیا اور صحابہ کا موقف نبی علیہ السلام کو بتایا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اُكْتُبْ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ» [1] لکھو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری زبان سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ حالت غضب ہو، حالت رضا ہو، میں حق ہی کہتا ہوں۔ جاگ رہا ہوں تو بھی، سو رہا ہوں تو بھی۔ میرا بولنا بھی حق ہے، عمل کرنا بھی حق ہے۔ خاموشی بھی حق ہے، ہر چیز حق ہے، لکھو۔ تو جہاں اطاعت کا معاملہ اتنا متعین ہو، وہاں حقیقت یہ ہے کہ وہاں ہر چیز حق ہے، ہر حال میں حق ہے۔ اس طرح ہر امام نے روکا۔ امام احمد بن حنبل کا قول تو بہت ہی صریح ہے کہ «لَا تُقَلِّدْنِي وَلَا تُقَلِّدْ مَالِكًا وَلَا الشَّافِعِيَّ وَلَا الْأَوْزَاعِيَّ وَلَا الثَّوْرِيَّ وَخُذْ مِنْ حَيْثُ أَخَذُوا» [2] میری تقلید نہ کرو۔ امام مالک کی تقلید نہ کرو، امام شافعی کی تقلید نہ کرو۔ امام مالک کے شیخ امام اوزاعی کی تقلید نہ کرو، امام سفیان ثوری کی تقلید نہ کرو، پھر کیا کرو؟ «وَخُذْ مِنْ حَيْثُ أَخَذُوا» اپنا دین تم بھی وہیں سے لو جہاں سے انھوں نے لیا۔ انھوں نے کہاں سے لیا؟ کتاب و سنت سے جو دین کا مصدر ہے۔ جو دین کا منبع ہے،

[1] سنن أبي داود، حديث:3646. [2] أعلام الموقعين:302/2، و روائع أبي حنيفة:3/1.

قرآن و حدیث: ﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ [1] اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب وحکمت، قرآن و حدیث نازل فرمائے ہیں، تم بھی وہیں سے دین لو۔ ایک تو یہ تناقض، یعنی جن ائمہ کی تقلید کی جارہی ہے وہ خود اس سے بری ہیں۔ اس سے روک کر گئے۔ منع کر کے گئے۔

دوسرا تناقض یہ ہے، ایک کتاب ہے: ...... فقہ حنفی کے مذہب کے جو اصول ہیں ان کو یہ بیان کرتی ہے۔ اس میں سے تین قول میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ دیکھیں کس طرح آپس میں اسی تقلید کے تعلق سے وہ تناقض کا شکار ہیں۔ پہلے تقلید کی تعریف سنیں: «قُبُولُ قَوْلِ الْغَيْرِ بِلَا حُجَّةٍ» تقلید کی تعریف یہ ہے کہ کسی کا قول دلیل کے بغیر قبول کرنا۔ یہ تقلید ہے، یعنی یہ پورے مذہب کی اساس ہے۔ دلیل کے بغیر کسی کا قول قبول کرنا۔ اسی کتاب میں آگے امام ابوحنیفہ ﷫ کا قول ہے کہ جو شخص میرے کسی قول کی دلیل نہیں جانتا اس کے لیے میرے کسی قول کا فتویٰ دینا حرام ہے، یعنی امام ابوحنیفہ ﷫ دلیل کا پابند کر رہے ہیں کہ جو میرے کسی قول کی دلیل نہیں جانتا، وہ میرے قول کا فتویٰ نہیں دے سکتا۔ اور تقلید کیا ہے؟ کسی کی بات کو بلا دلیل لینا۔ اور امام صاحب کیا فرمارہے ہیں؟ کہ میرے کسی قول کی دلیل معلوم نہ ہو تو اس کا فتویٰ دینا حرام ہے۔ اسی کتاب میں آگے جو ائمہ احناف ہیں، ان کا قول ذکر ہے، کہتے ہیں: «لَا يَحِلُّ لِأَحَدٍ أَنْ يُفْتِيَ بِقَوْلِنَا مَالَمْ يَعْلَمْ مِنْ أَيْنَ أَخَذْنَاهُ» [2] کہ ہمارے سارے ائمہ یہ بات کہہ گئے ہیں کہ کوئی شخص ہمارے کسی قول کا فتویٰ نہیں دے سکتا جب تک اسے معلوم نہ ہو کہ یہ قول ہم نے کہاں سے لیا ہے، یعنی دلیل کی بات

[1] النسآء 4:113. [2] الانتقاء في فضائل الثلاثة الأئمة الفقهاء، ص: 145، إعلام الموقعين: 2/309.

کتاب وسنت کی بات۔ تو کتنا تناقض ہے۔ یہ تقلید بغیر دلیل کے کسی کے قول کو لینا ہے اور جن کی تقلید کی جارہی ہے وہ فرمارہے ہیں کہ ہمارے کسی قول کی دلیل اگر معلوم نہ ہو تو اس کا فتویٰ آپ نہیں دے سکتے۔ اس کو اپنا نہیں سکتے۔ اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ جب تک اس کی دلیل معلوم نہ ہو جائے۔ تو کتنا تناقض ہے، یعنی تقلید میں اور صاحب تقلید کے قول میں۔ تقلید کچھ ہے اور جن کی تقلید کا دعویٰ ہے ان کا قول کچھ ہے۔ یہ تناقض ہے۔ جتنا اس سمندر میں آپ داخل ہوتے جائیں گے اتنا آپ حیرت میں ڈوبتے جائیں گے کہ یا اللہ! یہ مذہب کی کیسی بنیادیں ہیں؟ دین، دین تقلید نہیں ہے۔ دین، دین اتباع ہے۔

امام ابوحنیفہ ﷫ کا اختصاص کیوں ہے تقلید میں؟ سوال ہے کہ آپ نے انھیں کیوں چنا؟ کچھ لوگوں نے بڑے غلو سے کام لیا۔ اور ایک حدیث وضع کر دی۔ ایک جھوٹی حدیث لے آئے کہ ان کو ہم نے اس لیے چنا، ان کے بارے میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے: «وَيَكُونُ فِي أُمَّتِي رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ أَبُو حَنِيفَةَ هُوَ سِرَاجُ أُمَّتِي» [1] کہ کچھ دور کے بعد میری امت میں ایک شخص آئے گا جس کا نام ابوحنیفہ ہوگا، وہ میری امت کا سراج ہے۔ وہ میری امت کا سورج ہے۔ یہ حدیث مکذوب ہے۔ موضوع اور جھوٹی ہے، یعنی ان کی شان واضح کرنے کے لیے حدیثیں وضع کی گئیں۔ ہم یہی کہتے ہیں کہ کسی کی شان میں اگر صدق اور سچائی کی بنیادیں موجود ہوں تو کیا وہاں جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے؟! محمد رسول اللہ ﷺ، ان کی شان میں صدق کی بنیادیں موجود ہیں: ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ [2] سب سے بڑی شان ہے یہ۔

[1] سلسلة الأحاديث الضعيفة، حديث: 570. [2] بني إسرآء يل 17:79.

اس میں کوئی شخص شریک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود تک پہنچائے گا۔ یہ مقام دنیا کے ایک ہی انسان کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ وہ آپ کے لیے ہے۔ اس سے بڑا کوئی مقام نہیں۔ اس سے اونچی کوئی شان نہیں۔ ہم اس طبقے پر حیران ہوتے ہیں جو پیغمبر علیہ السلام کی شان میں غلو اختیار کرتا ہے۔ اپنی طرف سے باتیں کرتا ہے، اور جھوٹی شان بیان کرتا ہے۔ بھئی ضرورت کیا ہے؟ جب نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی ایسی ایسی شان قرآن و حدیث میں موجود اور منقول ہے تو جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے؟ حدیثیں وضع کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ جبکہ پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے: «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» [1] کہ جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔ وہ دنیا میں یہ طے کر کے جائے کہ قیامت کے دن میں نے جہنم ہی میں جانا ہے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ اگر ایک جھوٹ مجھ پر بول چکا ہو، ایک جھوٹی روایت میری طرف منسوب کر چکا ہو تو وہ یہ طے کر لے کہ قیامت کے دن میں نے سیدھا جہنم میں جانا ہے۔ اور کوئی صورت ہے ہی نہیں۔ چلیں حدیث وضع کر لی کہ وہ سراج امت ہوں گے، امت کے سراج ہوں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو سراج کہا ہے۔ سراج منیر، کہ سراج میرا پیغمبر ہے۔ انھوں نے کہا کہ سراج ہمارا امام ہے، یعنی دخل اندازی کی کوشش کی۔ حدیث بنا لی گئی۔ ان کو سراج قرار دے دیا گیا۔ اب ایک سوال اور ہے اور یہاں بڑی حیرت کا مقام ہے کہ جس کو سراج امت کہا گیا، اس کا عقیدہ کیوں نہیں لیتے۔ یہ عقیدے میں اشعری ہیں۔ عقیدے میں حنفی نہیں اشعری ہیں، ماتریدی ہیں۔ حالانکہ عقیدہ احکام سے اہم ہے۔

[1] صحيح البخاري، حديث: 110، و صحيح مسلم، حديث: 3.

نماز کے مسائل، روزے کے مسائل، حج و زکوٰۃ کے مسائل ان سے کہیں زیادہ اہم عقائد ہیں۔ اللہ کی توحید کے مسائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے مسائل ہیں۔ ایمانیات ہیں۔ ایمانیات اور عقائد عمل اور احکام سے زیادہ افضل ہیں۔ تو جس کو سراج امت بنا دیا گیا، ایک مقبول حدیث کے ذریعے اس کا عقیدہ لینے میں کیا رکاوٹ ہے۔ حالانکہ عقیدہ عمل سے اہم ہے۔ اب دو ہی باتیں ہیں: یا ان کا عقیدہ درست ہے یا غلط ہے۔ اگر درست تھا تو لیتے کیوں نہیں، غلط تھا تو پھر ان پر کیا حکم ہے۔ جس کو سراج امت کہا گیا ہے ان کا عقیدہ اگر تمھارے لیے قابل قبول نہیں ہے، اسی لیے قابل قبول نہیں کہ یقیناً تم اس کو غلط سمجھتے ہو، تو پھر کیا فتویٰ لگاؤ گے اپنے امام پر؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ تقلید کا معاملہ تناقضات کا مجموعہ ہے۔

اور اس سے بڑھ کر حیرت یہ ہے کہ فقہی احکام میں امام صاحب کی کوئی کتاب نہیں۔ اور جو فقہی احکام ان کی طرف منسوب ہیں، ان کی اسانید میں سے کوئی سند صحیح نہیں ہے۔ عقیدے میں ایک کتاب ہے فقہ اکبر۔ امت کا ایک طبقہ اس بات پر قائم اور قائل ہے کہ یہ امام صاحب کی تالیف ہے۔ چلیں اس میں اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں: ہے، کچھ کہتے ہیں: نہیں۔ لیکن ایک چیز کی اصل تو ہے نا! کہ جو چیز ان کی اپنی تالیف سے، ان کے قلم سے موجود ہے اس میں ان کی تقلید نہیں ہے۔ اور جو چیز ان کے قلم سے موجود نہیں ہے بلکہ ایسی اسانید سے ان کی طرف منسوب ہیں جن میں سے کوئی سند ثابت نہیں، صحیح نہیں، اس میں ان کی تقلید ہے۔ عقیدے میں کس کی تقلید ہے۔ امام اشعری کی، ابوالحسن اشعری۔ ابو منصور ماتریدی، حالانکہ اشعری کی ساری زندگی کے تین حالات اور ادوار ہیں۔ ایک ان کا دور تھا جب وہ عقیدے کے اعتبار سے معتزلی

تھے۔ اس پر کئی سال قائم رہے۔ یہ ان کا پہلا دور تھا۔ ان میں وہ معتزلی تھے۔ پھر وہ ایک شخص فولادی جو گلابی تھا، کچھ اس طرف کچھ اس طرف، اس سے متاثر ہوئے اور کچھ باتیں معتزلہ کی لے لیں اور کچھ اہل السنۃ والجماعۃ کی لے لیں اور بین بین ہو گئے۔ اور ان کی زندگی کا تیسرا دور جب وہ ہر طرف سے تھک گئے، پریشان ہو گئے اور اپنی آخری کتاب «کتاب الاماله» میں یہ بات لکھی کہ «أَنَا عَلَى مَذْهَبِ إِمَامِ أَحْمَدَ» کہ میں امام احمد بن حنبل کے مذہب پر ہوں۔ یہ خالص اہل السنہ کی طرف آ گئے، یعنی پہلے کے جو دو ادوار تھے ان سے توبہ کر لی، اعتزال سے توبہ کر لی، جو درمیانی راہ تھی اس سے توبہ کر لی۔ اور اسماء وصفات کے بارے میں، عقیدے کے باب میں یہ منہج اہل السنہ امام احمد بن حنبل کے منہج کے ترجمان ہیں۔ اسے اختیار کریں۔ تو اب حق تو یہ تھا کہ اگر اشعری بننا ہے تو امام اشعری کی زندگی کا جو آخری دور ہے اس کو لو۔ نہیں، اشعری بنے بھی تو ان کی زندگی کے پہلے دور کو لیا جس سے وہ توبہ کر چکے ہیں۔ تو عجیب تناقضات ہیں۔ امام اشعری ﷫ نے معتزلی عقائد کی تردید اور بیخ کنی کی ہے۔ مثلاً: آج احناف، اپنے آپ کو اشعری کہنے والے اللہ تعالیٰ کی صفت استوی علی العرش کی تاویل کرتے ہیں کہ استویٰ بمعنی استعلاء ہے، یعنی غلبہ۔ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا، معنی اللہ عرش پر غالب ہوا۔ یہ تاویل ہے جو باطل ہے۔ بلکہ لوگ تاویل کہتے ہیں، میں اس کو تحریف کہتا ہوں۔ یہ معنوی تحریف ہے۔ کبھی تحریف لفظی ہوتی ہے اور کبھی معنوی۔ یہ معنوی تحریف ہے۔ استویٰ کا معنی استعلاء کرنا معنوی تحریف ہے۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے ہی نہیں۔ اس کا معنی تو یہ ہوگا کہ اللہ عرش پر مستوی ہوا، یعنی غالب ہوا۔ تو کیا اللہ تعالیٰ صرف عرش پر غالب ہے؟ کسی اور چیز پر غالب نہیں ہے؟ اگر کہو کہ نہیں ہے تو یہ اللہ رب العزت کی

توہین ہے اور یہ کفر ہے۔ اگر کہو کہ ہے تو پھر عرش کی تخصیص کا معنی کیا ہوا؟ اور امام اشعری نے اپنی کتاب «الاماله» میں یہ سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر غالب ہے، پھر غلبے کے اعتبار سے عرش جو سب سے اوپر ہے اور ساتویں زمین جو سب سے نیچے ہے، ان دونوں میں کیا فرق ہوگا؟ اللہ اس پر بھی غالب ہے، اس پر بھی غالب ہے۔ پھر عرش کی تخصیص کا کیا معنی؟ تو جو ان کے مناہج یا عقائد ہیں امام ابوالحسن اشعری اپنی کتاب میں اس کی تردید کرتے ہیں۔ تو اگر اشعری بنے بھی تو ان کی زندگی کا وہ دور لیا جس سے وہ رجوع کر چکے تھے، توبہ کر چکے تھے۔ تو یہ سب تناقضات کا منبع ہے۔

اور میں نے عرض کیا کہ جو شبہات تقلید کے جواز اور اثبات کے لیے پیش کیے جاتے ہیں ان پر اگر آپ غور کریں گے تو وہ سارے کے سارے ترکِ تقلید، نفیِ تقلید، مذمتِ تقلید اور انکارِ تقلید پر منتج ہوتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کا ایک فرمان سورۂ یوسف میں ہے، اس سے استدلال کرتے ہیں: ﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ﴾ [1] یوسف علیہ السلام نے کہا کہ میں نے اپنے آباء کے دین کی پیروی کی۔ کہتے ہیں کہ جب آباء و اجداد کی پیروی درست ہے تو ائمہ و علماء کی پیروی تو بالاولیٰ درست ہے۔ یہ اس شبہ کی تقریر ہے۔ اللہ اکبر۔ اتنا غور نہ کیا کہ یوسف علیہ السلام کون ہیں اور ان کے آباء کون ہیں؟ ان کے باپ کون ہیں؟ سارے کے سارے اللہ کے پیغمبر ہیں۔ یوسف علیہ السلام بھی اللہ کے نبی ہیں۔ اور ان کے آباء یعقوب علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام بھی انبیاء ہیں۔ کیا انبیاء کی پیروی تقلید ہے؟ اور یہاں لفظ اتباع ہے، اس سے تقلید ثابت ہو رہی ہے یا اس کی تردید ہو رہی ہے۔ یوسف علیہ السلام اگر کسی غیر نبی کا ذکر کرتے کہ میں تو فلاں کی بات مانتا ہوں جو کہ ان کے

[1] یوسف 12:38.

شایانِ شان نہیں تھا کیونکہ وہ بھی اللہ کے نبی ہیں۔ اور نبی کبھی امتی کا مطیع نہیں ہوتا۔ نبی مطاع ہوتا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللهِ﴾ [1] ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ مطاع بن کر آیا، مطیع بن کر نہیں۔ وہ اطاعت کیا جانے والا ہوتا ہے، اطاعت کرنے والا نہیں ہوتا۔ اس کی پیروی کی جاتی ہے، وہ کسی کی پیروی نہیں کرتا۔ ہاں، ایک نبی ہے جو امتی کی اطاعت کرنے والا بن کر آیا تھا۔ آخر شیطان نے بھی اپنا کردار ادا کرنا تھا نا۔ آپ کا مرزا غلام احمد قادیانی جس نے بارہا اقرار و اعتراف کیا ہے کہ میں انگریز بہادر کی اطاعت کرنے والا ہوں۔ اطاعت کرنے والا بن کر آیا ہوں۔ انگریزوں کا مطیع بن کر آیا ہوں۔ یہ جھوٹا نبی ہے۔ نبی تو مطاع بنتا ہے، مطیع نہیں بنتا۔ انگریزوں کے قصیدے کیوں نہ کہے وہ؟ مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے لیے انگریزوں نے اس فتنے کو چھوڑا اور قائم کیا۔ وہ انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ کہ میں تو انگریز بہادر کی اطاعت کرنے والا بن کر آیا ہوں۔ نبی مطاع ہوتا ہے، مطیع نہیں ہوتا۔ یوسف علیہ السلام اگر غیر نبی کا نام لیتے جو کہ ناممکن تھا کیونکہ وہ نبی ہیں اور نبی کسی امتی کا مطیع نہیں ہوتا، یوسف علیہ السلام نے اپنے آباء ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی ملت کا ذکر کیا کہ ان کا پیروکار ہوں۔ اور یہ سارے اللہ کے نبی ہیں۔ اور اللہ کا نبی اللہ کی وحی سے بات کرتا ہے۔ یہاں پر جو اتباع ہے اس کی اساس بھی اللہ کی وحی ہے اور یہ تحقیق ہے جو ترکِ تقلید ہے۔ اس سے تقلید ثابت نہیں ہوتی۔ اگر کہو کہ آباء واجداد کا نام ہے، آباء واجداد کا لفظ ہے تو اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو۔ یہ آباء واجداد میرے آپ کے نہیں ہیں۔ یہ آباء واجداد اللہ کے انبیاء ہیں۔ آباء واجداد ہونے میں نبی اور غیر نبی

[1] النسآء 4:64.

میں فرق نہیں ہوگا؟ باپ دادا ہونے میں نبی اور غیر نبی میں فرق نہیں کرو گے؟ ایک باپ عام ہے، دادا عام ہے اور ایک باپ دادا وہ ہے جو اللہ کی نبوت سے سرفراز ہے۔ جس کے سر پر تاجِ نبوت ہے۔ کیا دونوں کا مقام ایک ہے؟ وہ باپ ہونے میں ایک نوعیت کا شکار ہیں؟ نہیں۔ یہاں پر اتباع کا لفظ ہے، تقلید کا لفظ نہیں ہے۔ آباء واجداد کا لفظ اگر ہے تو وہ آباء واجداد اللہ کے انبیاء تھے۔ انبیاء کی پیروی تقلید نہیں ہے، یہ تو عین تحقیق ہے بلکہ اصل اصول ہے اور یہ ہماری دعوت ہے۔ جس چیز کو توڑ مروڑ کر تقلید کے جواز پر پیش کیا جارہا ہے قطعاً تقلید کا جواز نہیں ہے بلکہ وہ دعوت اہلحدیث ہے، انبیاء کی پیروی۔ اپنے دور میں یعقوب علیہ السلام، اپنے دور میں اسماعیل علیہ السلام، اپنے دور میں ابراہیم علیہ السلام، اپنے دور میں اسحاق علیہ السلام واجب الاتباع تھے کیونکہ اللہ کے انبیاء تھے۔ آج محمد رسول اللہ ﷺ واجب الاتباع ہیں کیونکہ اللہ کے نبی ہیں۔ آج یعقوب علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام واجب الاتباع نہیں ہیں، واجب الایمان ہیں۔ ان پر ایمان لانا فرض ہے۔ اتباع صرف محمد رسول اللہ ﷺ کا حق ہے۔ ہر نبی اپنے دور میں مطاع ہوتا ہے۔ تو اس دلیل میں سے تو تقلید کہیں سے نہیں نکل رہی۔ یہ تو اتباع وحی کا نام ہے۔ اتباع انبیاء کا نام ہے اور یہ قطعاً تقلید نہیں۔ ان لوگوں کو لفظِ آباء سے دھوکا ہوا کہ میں نے اپنے آباء واجداد کی ملت کی پیروی کی۔ اور یہ نہیں سوچا کہ آباء واجداد ہیں کون؟ یہ عام آباء واجداد نہیں بلکہ یہ سارے آباء واجداد اللہ کے انبیاء تھے۔ ابراہیم علیہ السلام جد الانبیاء ہیں۔ سارے انبیاء کے باپ اور دادا ہیں۔ بلکہ وہ نبی ہیں کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا: ﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ [1] کہ اے محمد! ہم آپ کو

[1] النحل 16:123.

وحی کررہے ہیں کہ آپ بھی ملت ابراہیمی کی پیروی کریں۔ ہم کس کے پیروکار ہیں؟ محمد رسول اللہ ﷺ کے۔ محمد رسول اللہ ﷺ جس چیز میں ملت ابراہیمی کی پیروی کریں گے، اس میں ہم پیروی کریں گے۔ ملت ابراہیمی تک ہماری پہنچ، ہماری رسائی براہ راست نہیں ہے بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ تو یہاں تو کوئی تقلید کا نام ونشان بھی نہیں۔ اتباع ہے، تقلید نہیں ہے۔ «اِتَّبَعْتُ» ہے «تَقَلَّدْتُّ» نہیں ہے۔ اور جن آباء واجداد سے آپ کو مغالطہ ہوا وہ سارے کے سارے اللہ کے انبیاء ہیں۔ نبی کی اتباع تقلید نہیں ہوتی۔ کیونکہ تقلید کا معنی کسی کی بات کو بلا دلیل لینا اور نبی خود دلیل ہے۔ نبی کی ذات دلیل ہے۔ نبی کی ہر حرکت دلیل ہے۔ نبی کا بولنا، خاموش رہنا، اپنا عمل کرنا سب دلیل اور سب حجت ہے۔ نبی کا جاگنا دلیل ہے۔ نبی کا سونا دلیل ہے۔ اور یہ تقلید نہیں، اتباع ہے۔

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [1] اگر تمھیں علم نہ ہو تو اہل الذکر سے سوال کرو، یعنی اہل الذکر کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے۔ اور سوال کرنے کا فائدہ یہ کہ سوال کرکے ان کی بات مانو اور یہ تقلید ہے۔ اللہ اکبر! کتنا عجیب شبہ ہے یہ! یہاں پر تین چیزیں قابل غور ہیں: ایک لفظ ﴿فَسْـَٔلُوْٓا﴾ دوسرا ﴿اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ اور تیسرا ﴿اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾، یعنی آیت کا ہر لفظ، ہر جملہ قابل غور ہے۔ ﴿فَسْـَٔلُوْٓا﴾ سوال کرو۔ کیا سوال کا نتیجہ پیروی ہے؟ یعنی جس سے جو مرضی سوال کرو، اس لیے کہ پھر اس کو مانو، سوال کا نتیجہ پیروی ہوتا ہے کیا؟ نہیں۔ اگر اس کا جواب قابل قبول ہے تو مانو اور قابل قبول نہیں ہے تو نہ مانو۔ اس سوال سے پیروی کہاں نکلتا ہے؟ آئیے، سوال

[1] النحل 16:43.

کی حقیقت پر غور کریں۔ ایک سفر کا واقعہ ہے۔ صحابہ کرام ایک غزوے سے لوٹ رہے تھے۔ لوگ پھیلے ہوئے تھے، ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا اور پڑاؤ میں ظاہر ہے کہ خیمے اوپر ہوتے ہیں، نیچے پہاڑوں پر لوگ پھیل جاتے ہیں سائے کی تلاش میں، پانی کی تلاش میں۔ پڑاؤ ڈال لیا گیا، دو چار صحابہ ایک جگہ خیمہ میں ذرا دوری پر تھے۔ رات سوئے تو نیند میں ایک صحابی کو غسل کا عارضہ پیش آگیا۔ ان پر غسل فرض ہوگیا اور اتفاق ایسا کہ ان کا سر زخمی تھا۔ زخم گہرا تھا اور سر کھلا ہوا تھا۔ اب فجر کی نماز سے قبل اپنے دوستوں سے پوچھتا ہے کہ میں کیا کروں؟ مجھ پر غسل فرض ہو چکا ہے۔ لیکن میں بیمار ہوں، زخمی ہوں اور نماز بھی پڑھنی ہے، کیا اب میں تیمّم کروں؟ تو ایک صحابی نے، اس کے ایک بھائی نے مشورہ دیا، فتویٰ دیا کہ تو تیمّم نہیں کرسکتا بلکہ تجھ پر غسل کرنا فرض ہے۔ جو نص اس کے سامنے تھی اور جو فرضیت کا اس کا فہم تھا، اس کے مطابق اس نے جواب دے دیا کہ جنابت کا عارضہ ہو جائے تو غسل فرض ہے۔ تمھیں غسل کرنا پڑے گا۔ اس نے اس بات کو مانا، غسل کرلیا۔ اس زخم میں سے پانی اندر داخل ہوا اور اس کی موت واقع ہوگئی، اس کا انتقال ہوگیا۔ ان شاء اللہ یہ شہادت کی موت ہے۔ میدان جہاد میں جاتے ہوئے کوئی مر جائے یا لوٹتے ہوئے، وہ اللہ کے ہاں شہید ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس کی خبر ملی۔ فرمایا کہ «قَتَلُوهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ» [1] فتویٰ دینے والے نے اسے قتل کردیا، اللہ ان کو قتل کردے۔ یعنی یہ بددعا نہیں تھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے نکلا ہوا جملہ، اس طرح کے نکلے ہوئے دیگر جملے بددعا نہیں ہوتے۔ یہ اکثر زبانوں پر ہوتے ہیں۔ ان کو بددعا نہیں کہا جاسکتا۔ اور ویسے بھی پیغمبر نے آخر میں دعا کردی تھی کہ یا اللہ! میں

[1] سنن أبي داود، حديث:336، و سنن ابن ماجه، حديث:572.

نے اپنی امت میں سے کسی فرد پر اگر کوئی بد دعا کی ہو، کوئی لعنت بھیجی ہو تو اس سب کو تو رحمت بنا دے۔ [1] تو سلسلہ ختم ہوچکا، بد دعا نہیں ہے۔ اس موقع پر پیغمبر علیہ السلام نے ایک بات کہی تھی: «أَلَا سَأَلُوا» انھوں نے سوال کیوں نہیں کیا؟ یہ خود جواب کیوں دے دیا، سوال کیوں نہیں کیا؟ «إِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ» ایک مریض کی شفا تو سوال میں ہے۔ انھوں نے سوال کیوں نہیں کیا۔ اس مریض نے سوال تو کیا تھا۔ اس کا معنی جس سوال کا شریعت حکم دے رہی ہے وہ سوال کچھ اور ہے۔ اس کی حدود کچھ اور ہیں۔ جب پیغمبر علیہ السلام موجود ہیں تو پیغمبر علیہ السلام سے کیوں نہ پوچھا؟ ایک بھائی نے ان سے ایک بات پوچھی تو نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے رجوع کا حکم کیوں نہ دیا؟ کہ تھوڑا سا چل کر چلے جاؤ، پیغمبر علیہ السلام سے پوچھ لو۔ تم مریض ہو اور مریض کی شفا سوال میں ہے۔ یعنی سوال کا ہر جواب لائق قبول نہیں ہوتا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے: سوال کیوں نہیں کیا؟ اس شخص نے سوال کیا تھا لیکن سوال کی حدود ہیں۔ اور جواب کی حدود ہیں۔ سوال کسی کی رائے سے متعلق نہ ہو اور جواب دینے والا بھی اپنی رائے سے جواب نہ دے۔ «أَلَا سَأَلُوا» سوال کیوں نہیں کیا؟ یعنی پیغمبر علیہ السلام موجود تھے، کبار صحابہ موجود تھے۔ ان سے پوچھ لیا جاتا تاکہ جواب دلیل کے ساتھ ہوتا۔ یہ جواب اس صحابی کی خالص رائے تھی۔ سوال اور جواب دلیل کے ساتھ مقید ہیں۔ تو شریعت میں کس قسم کا سوال مطلوب ہے؟

اس حدیث سے واضح ہو رہا ہے، تو یہاں بات سوال کرنے کی ہے تقلید کی نہیں۔ اگر قَلِّدُوا ہوتا، تقلید کرلو اہل ذکر کی اس مسئلے میں جس میں آپ کو علم نہ ہو تو پھر یہ موقف درست ہوتا، پھر بھی تقلید شخصی درست نہ ہوتی۔ اور یہ بات بھی بنیادی طور پر

[1] صحيح البخاري، حديث:6361، و صحيح مسلم، حديث:2601.

آپ پہچان لیجیے کہ لوگوں نے تقلید کے اثبات میں جو دلائل پیش کیے ہیں، وہ سارے عمومی ہیں اور جھگڑا کسی عمومی بات کے ماننے کا نہیں ہے بلکہ جھگڑا اس بات کا ہے کہ پوری امت میں سے ایک شخص کا انتخاب کر کے اس کے سر پر پورے دین کی عمارت قائم کر دی جائے، اس کا کیا ثبوت ہے؟ علماء سے پوچھو، ہزاروں علماء ہیں۔ علماء سے پوچھنے کی صورت میں کسی ایک فرد کی تقلید ثابت نہیں ہوتی۔ نزاع اس میں نہیں ہے، علماء سے پوچھیں، مسائل معلوم کریں۔ سوال کی حقیقت کیا ہے، وہ آپ نے سن لی اور یہاں نزاع اس بات پر نہیں ہے کہ علماء سے پوچھا جائے یا نہ پوچھا جائے۔ نزاع یہ ہے کہ پوری امت میں سے، امت میں ہزاروں علماء ہیں، سیر أعلام النبلاء امام ذہبی کی اٹھا کر دیکھو۔ ہزاروں علماء کی فہرست آپ کو ملے گی، تذکرۃ الحفاظ ہے امام ذہبی کی، تہذیب التہذیب ہے ابن حجر کی، اٹھا کر دیکھو۔ اور بہت سی کتابیں ہیں، تہذیب الکمال، ان میں علماء کی فہرست آپ کو ملے گی، ہزاروں علماء ہیں، ان ہزاروں میں سے ایک شخص کا انتخاب کر کے اس کے سر پر پورے دین کی عمارت رکھ دی جائے، اسے کوئی ثابت کرے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ تو عمومی باتیں ہیں، علماء سے سوال کرو۔ تو سوال کرنا اور ہے اور تقلید کرنا اور ہے۔ سوال جواب کریں گے تو کوئی عالم جواب دے گا، اس کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ سوال اور اس کا جواب درست ہے، آپ اس کو قبول کرلیں۔ درست کیوں ہے، اس کے جواب کی اساس کتاب اللہ یا سنتِ رسول ﷺ ہے تو آپ قبول کرلیں۔ قبول کرلیا تو یہ تقلید نہیں، کیونکہ اس نے قرآن یا حدیث کی نص پیش کی ہے اور تقلید بلا دلیل بات ماننے کو کہتے ہیں۔ اتباعِ دلیل تقلید نہیں ہے۔ یہ تقلید نہ ہوئی، اگر اس کا جواب غلط ہے تو اسے قبول نہیں کرنا۔ پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ» [1] مخلوق کوئی بھی ہو، اس کے کسی قول میں، فتوے میں اگر خالق کی نافرمانی ہو تو اس میں اس کی کوئی پیروی نہیں، کوئی اطاعت نہیں، چاہے وہ حاکم ہو، عالم ہو، اس کی کوئی اطاعت نہیں۔ پھر دوسری بات اہل الذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اہل الذکر سے پوچھو، یہ اہل الذکر کی تخصیص کا معنی کیا ہے؟ اہل الذکر کون ہیں؟ قرآن و حدیث والے۔ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [2] اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں، اس قرآن و حدیث کو ہم نے اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ تو اہل الذکر سے پوچھو۔ اہل الذکر کی قید کیوں لگائی؟ اہل الذکر کی قید لگانے میں فائدہ یہ ہے کہ ان سے پوچھو جن کے پاس قرآن و حدیث کا علم ہو تاکہ تمھیں جواب قرآن و حدیث کے مطابق ملے اور قرآن و حدیث کے مطابق جواب دینا اور اسے قبول کرنا، کیا یہ تقلید ہے؟ تقلید تو بلا حجت کسی کے قول کو ماننا ہے۔ یہ تقلید نہیں، تو اہل الذکر کی قید ہی سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ یہ آیت اور یہ مقام ترکِ تقلید کا ہے۔ اثباتِ تقلید کا نہیں۔ اہل الذکر، علماء، علمائے ربانیین جو کتاب وسنت سے تمھارے سوالوں کے جواب دیں۔ بعض اہل تقلید سے سوال ہوا کہ فلاں مسئلے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیجیے۔ انھوں نے جواب دیا اپنے امام کے قول سے اور جواب دینے کے بعد اس سائل کے خوب لتے لیے۔ تم حنفی تھے، تم نے قرآن و حدیث کا نام کیوں لیا۔ تمھیں تو کہنا چاہیے تھا کہ ہمارے امام نے کیا فرمایا ہے۔ ہمارے امام کا قول، ان کا فتویٰ کیا ہے۔ تم نے قرآن و حدیث کا نام کیوں لیا؟ باقاعدہ ڈانٹا۔ اب یہ لوگ تقلید کے اثبات میں اس آیت کو پیش کر سکتے ہیں؟ ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ یہ تو روکتے ہیں کہ سوال کرنے والو! قرآن و حدیث کا نام نہ

[1] مسند أحمد: 131/1. [2] الحجر 9:15.

لو۔ اور قرآن کہتا ہے ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ اہل ذکر سے پوچھو۔ اہل الذکر کی قید کا فائدہ کیا ہے، قرآن و حدیث والوں سے پوچھو تاکہ وہ اس کے مطابق جواب دیں اور تم تو ڈانٹتے ہو کہ قرآن و حدیث کا نام کیوں لیا۔ تمھیں تو حنفی شافعی ہونے کے ناتے اپنے امام کا نام لینا چاہیے تھا کہ ان کی رائے کیا ہے، ان کا فتویٰ کیا ہے تو پھر یہی لوگ اس آیت کو اثبات تقلید میں پیش کریں تو یہ کون سی منطق ہے۔

اور تیسری بات ﴿اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [1] اہل ذکر سے سوال کب کرنا ہے۔ جب تمھیں معلوم نہ ہو، تم اپنے طور پر تحقیق کرتے کرتے تھک گئے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ تمھیں اس کا علم حاصل نہ ہو سکا تو اب تم اپنے سے بڑے جو علماء ہیں، اہل الذکر ان کی طرف رجوع کرو، ان سے پوچھو تاکہ وہ تم کو صحیح رہنمائی دے سکیں۔ اگر یہ آیت تقلید کے جواز میں ہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تقلید کب کرنی ہے۔ اس مسئلے میں کرنی ہے جس میں آپ کو علم نہ ہو۔ آپ نے کوشش کی اور کتاب و سنت سے علم حاصل نہ کر سکے اور یہ سارا ثمر تحقیق کا ہے تقلید کا نہیں۔ علم نہ ہو تب سوال کرو۔ جب علم ہو تو سوال کرنا جائز نہیں۔ امیر عمر کے پاس ایک سائل آیا اور سوال کیا، آپ نے جواب دیا، اس نے کہا: میں نے یہ سوال اللہ کے پیغمبر سے کیا تھا۔ آپ کا جواب اور تھا تمھارا جواب اور ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ تو بعد میں سنوں گا، ذرا میرے قریب آجاؤ۔ قریب بلالیا اور درہ پکڑ لیا: «سَأَلْتَنِي فِيمَا سَأَلْتَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ» جس مسئلے میں تم نے اللہ کے رسول سے سوال کیا اور جواب معلوم تھا، اس بارے میں مجھ سے کیوں سوال کیا؟ تو سوال کب کرنا ہے، جب آپ کے پاس علم نہ ہو۔ اگر یہ تقلید کا جواز ہے تو اس کا معنی ہے کہ تقلید وہ کرے جس کے پاس علم نہ ہو اور

[1] النحل 43:16.

یہاں ہر شخص مقلد ہے۔ اگر یہ تقلید کا جواز ہے تو یہ جواز ان کے لیے ہے جن کے پاس علم نہ ہو اور یہاں بڑے بڑے علامہ وفہامہ، غزالیِ دوران، بڑے بڑے القاب اور سب کے سب مقلد۔ اگر یہ دلیل پیش بھی کی جائے تو صرف ان کے لیے جن کے پاس علم نہ ہو اور یہاں سارے دین کی عمارت ائمہ کے سر پر کھڑی کر دی گئی تو یہ تینوں باتیں اگر آپ غور کریں گے، سوچیں گے تو تقلید کے اثبات کی دلیل نہیں بلکہ تقلید کے رد کی دلیل ہیں اور تحقیق کی طرف دعوت دے رہی ہیں۔ سوال کرنا تحقیق ہے۔ اہل علم سے رجوع کرنا جن کے پاس قرآن وسنت کا علم ہو، ان سے سوال کرنا تاکہ وہ قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیں، یہ تقلید نہیں بلکہ تحقیق ہے اور ﴿ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ میں تحقیق ہی ثابت ہو رہی ہے کہ جہاں تم کو علم نہ ہو، تم نے پڑھا، مطالعہ کیا، لیکن تم علم تک نہ پہنچ سکے، اب تم علماء سے پوچھو۔ علماء بھی کون؟ اہل الذکر۔ علماء دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک علمائے راسخین، ربانیین، دوسرے علمائے سو، برے علماء، اپنی رائے سے فتویٰ دینے والے۔ علمائے ربانیین جن کے پاس نورِ وحی ہوتا ہے، آپ گہرائی سے سوچیں، وہ تقلید کا اثبات نہیں بلکہ تقلید کا رد ہے۔ تقلید کی تردید اور نفی ہے۔ ایک اور آیت ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾[1] اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اولو الامر کی۔ اولوالامر کا جو معنی آپ نے کیا چلیں ہم بھی قبول کرتے ہیں۔ اولوالامر میں دو چیزیں ہیں۔ ایک حکام، دوسرے علماء۔ ٹھیک ہے یہ تفسیر قابل قبول ہے۔ حکام اور علماء، ان کی بھی اطاعت کرو، بھئی پہلے اللہ کی اطاعت ہے، پھر رسول کی اطاعت ہے، تیسرا نمبر علماء کا ہے یا حکام کا اور تم نے اللہ اور اس کے رسول کے نام کو گویا حذف کر دیا اور یہ دین ہے ہی دینِ تقلید۔

[1] النسآء 4:59.

اولو الامر تک رسائی تیسرے درجے کی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اصل ہے، اس لیے ان دونوں اطاعتوں سے قبل اطیعوا کا لفظ ہے، اولو الامر سے پہلے اطیعوا کا لفظ نہیں ہے، لہٰذا اصلی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ لیکن میں تحقیقی جواب دینے سے پہلے ایک الزامی جواب دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس آیت سے اثباتِ تقلید کا استدلال کیوں کیا جاتا ہے؟ اگر یہ آیت اثباتِ تقلید میں کافی ہوتی تو اس میں آپ لوگوں کو تحریف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور یہ ایک عجیب تماشا ہے، عجیب مذاق ہے، کتاب اللہ میں اضافہ ہے اور یہ کفر ہے، فعل یہود ہے: ﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ﴾[1] کہ وہ تورات کی نصوص میں تحریفیں کیا کرتے تھے۔ اگر یہ آیت اثباتِ تقلید میں کافی وشافی ہوتی تو تحریف کی نوبت کیوں آئی؟ اور یہ تحریف بھی کسی عام انسان نے نہیں کی بلکہ مولانا محمود الحسن جو دیوبندیوں کے سرخیل ہیں، انھوں نے کی۔ اپنی کتاب ''ایضاح الادلہ'' میں واشگاف الفاظ میں لکھا، آیت لکھی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ، وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ یہ اپنی طرف سے اضافہ کیا کہ اطاعت کرو اللہ کی، اس کے رسول کی اور اولی الامر کی اور اگر تمھارا کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ یہاں اولی الامر کا نام نہیں ہے۔ انھوں نے خود اولی الامر کا نام اپنی طرف سے ڈالا اور ساتھ یہ لکھا ہے جس قرآن میں یہ آیت ہے اُولِي الْاَمْرِ کے بغیر، اس میں یہ آیت اُولِي الْاَمْرِ کے ساتھ بھی ہے۔ پورا قرآن آپ کے سامنے موجود ہے، کہیں یہ آیت نکال کر دکھاؤ۔ اس مجلس میں بیسیوں حافظ بیٹھے ہیں۔ اگر میں غلط کہہ رہا ہوں، میری

[1] النسآء 4:46.

تردید کیجیے۔ کیا قرآن مجید میں یہ آیت ہے: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ تو اگر یہ اثباتِ تقلید کی دلیل ہوتی کفایت کرنے والی تو اس میں تحریف کیوں کی جاتی۔ کوئی شخص تحریف جیسے فعل مذموم کا سہارا اسی وقت لے گا جس کا ہاتھ دلیل سے خالی ہو۔ دلیل سے مالا مال بھلا تحریف کرے گا؟ جو دلائل سے مالا مال ہو، وہ تحریف کرے گا؟ تحریف وہ کرے گا جو دلیل کے میدان میں تہی دست ہو، تہی دامن اور خالی ہاتھ ہو، تو بات یہ ہے کہ یہ آیت تقلید کے جواز میں قطعاً دلیل نہیں بنتی، بلکہ ترکِ تقلید کی دلیل ہے۔ ہم پہلے اس کے نزول کا پس منظر دیکھتے ہیں کہ یہاں معاملہ کیا ہے۔ اس کے اول مخاطبین کون ہیں، صحابۂ کرام ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی، اس وقت ایمان والے کون تھے؟ صحابۂ کرام۔ اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ وہ کون اولی الامر تھے جن کی اطاعت کا حکم دیا گیا، صحابہ کے دور میں جہاں اللہ کے پیغمبر موجود ہیں، پھر کون اولی الامر ہیں جن کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ امام شافعی ﷫ نے اس کی تفسیر بیان کی، بڑی قابلِ قبول کہ پیغمبر ﷺ کے دور میں کون اولی الامر تھے جن کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے؟ اور بصورت اختلاف ان کا نام حذف کر کے اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پیش کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، کون تھے وہ، کون سے حکام تھے، کون سے علماء تھے کہ نبی ﷺ کے ہوتے ہوئے جن کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ بتاتے ہیں کہ معاملہ یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے دور میں کبھی یہ وقت آتا تھا کہ نبی ﷺ کوئی قافلہ روانہ کرتے جس کو اصطلاحاً سریہ کہا جاتا ہے، لشکر، لشکر روانہ کرتے۔ اس لشکر کا ایک امیر مقرر کرتے کہ یہ آپ کا امیر ہے، امیر سفر ہے۔ پوری مہم کے دوران یہ آپ کا امیر ہے۔ وہ امیر اللہ کے پیغمبر کا مقرر کیا ہوا

ہوتا۔ قرآن جو کہہ رہا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کرو، یہ ایک ہی معنی پیغمبر ﷺ کے دور میں اولی الامر کا ملتا ہے ورنہ اور کوئی اولی الامر نہیں تھے کہ جو قافلے بھیجتا ہو۔ ان قافلوں کا امیر مقرر کرتا ہوں، اس امیر کی تم نے اطاعت کرنی ہے۔ امیر سفر کی اطاعت کرنی ہے، ورنہ اور اس دور میں کوئی ایسا اولی الامر نہیں تھا جس کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہو۔ اس آیت کا اول مخاطب اللہ کے پیغمبر کے صحابہ ہیں۔ اس امیر کی اطاعت کیا تقلید ہے؟ تقلید تب ہوتی ہے جب اس امیر کی اطاعت سو فیصد ہوتی۔ اس امیر کی اطاعت مقید ہے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ «لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ»[1] اگر یہ امیر بھی کوئی ایسی بات کہہ دے جس میں خالق کی نافرمانی ہے تو اس کی اطاعت نہیں ہوگی۔ اس کی مثال صحیح بخاری میں موجود ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قافلہ بھیجا اور ایک صحابی کو اس کا امیر مقرر کر دیا اور کہا: اس کی اطاعت کرنی ہے۔ اب اس امیر نے سوچا کہ ابھی سے اس قافلے والوں کی اطاعت کا امتحان لے لوں تاکہ آگے مجھے پریشان نہ کریں۔ امیر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک آرڈر جاری کیا کہ ایندھن اکٹھا کرو۔ امیر کی اطاعت تھی، لوگ پھیل گئے۔ ایندھن اکٹھا کر کے لا رہے ہیں۔ ایک ڈھیر لگا دیا۔ کہا: آگ لگا دو۔ آگ لگا دی گئی۔ حکم ہوا: سب اس میں کود جاؤ۔ اب صحابہ کے دو گروہ ہو گئے۔ کچھ تو کودنے کے لیے تیار ہو گئے کہ اللہ کے پیغمبر کا امر تھا کہ امیر کی اطاعت کرنی ہے اور کچھ ان کو کھینچ رہے ہیں کہ مت کودو۔ اس آگ سے بچاؤ کے لیے ہم نے کلمہ پڑھا ہے۔ کلمہ پڑھ کر بھی اگر آگ ہی میں جانا ہے تو کلمے کا فائدہ کیا، چنانچہ وہ ان کو کھینچ رہے ہیں۔ کچھ لوگ کودنے کی کوشش کر رہے ہیں، کچھ ان کو کھینچ رہے ہیں، اسی کھینچا تانی میں آگ ٹھنڈی ہو گئی اور امیر کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن

[1] مسند أحمد: 131/1.

امیر نے کہا: میں یہ معاملہ اللہ کے رسول کو پیش کروں گا کہ تم نے میری اطاعت کیوں نہیں کی۔ غزوے سے واپس لوٹے، پیغمبر علیہ السلام سے ماجرا ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے امیر کی اطاعت کرتے ہوئے اگر تم لوگ آگ میں کود جاتے تو قیامت تک آگ ہی میں رہتے، کبھی نہ نکلتے۔ اب یہ آپ کے حکمران، کیا ان کی سو فیصد اطاعت ہے؟ ان کا کوئی معاملہ یا اقدام اللہ یا اس کے رسول کے فیصلے کے خلاف ہے تو اس میں ان کی کوئی اطاعت نہیں۔ اور یہ تقلید کہاں ہے؟ اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی امیر ہو، اس کا فتویٰ، اس کا اقدام اور اس کا فیصلہ، اس کی رائے کتاب وسنت پر پیش کی جائے گی۔ ورنہ پیغمبر ﷺ جھنجوڑتے کہ تم نے میرے امیر کی اطاعت کیوں نہ کی، حالانکہ جس کو آپ نے امیر مقرر کیا تھا، اس کی اطاعت پر تو نصِ قطعی موجود تھی۔ جن ائمہ کو آپ نے امام بنایا ہے، وہ استنباطی امام ہو سکتے ہیں لیکن وہ تحقیقی امام تھا، وہ اللہ کے پیغمبر کے مقرر کرنے سے امام بنا تھا۔ اس پر نصِ قطعی موجود ہے، پھر اس کا فتویٰ اور فیصلہ کتاب وسنت پر پیش ہوگا۔ ورنہ پیغمبر ﷺ کیوں فرماتے: «لَوْ دَخَلُوا فِيهَا لَمْ يَزَالُوا فِيهَا» [1] اگر یہ لوگ آگ میں کود جاتے تو قیامت تک ہمیشہ اس آگ میں جلتے رہتے۔ کیوں فرمایا یہ؟ اولی الامر میں قطعاً تقلید کا ذکر نہیں۔ آگے چلو ﴿فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ﴾ اگر تمھارا تنازعہ ہو جائے، اختلاف ہو جائے کسی چیز میں تو یہاں اولی الامر کا پتا کٹ چکا ہے۔ اس کو لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف۔ اب میرا آپ سے ایک سوال ہے۔ کوئی ایک فقہی مسئلہ ایسا بتا دو جس میں اختلاف نہ ہو، کوئی ایک مسئلہ؟ فقہاء کے مابین کوئی ایک مسئلہ ایسا دکھا دو جس میں اختلاف نہ ہو۔ باقی مذاہب چھوڑو، فقہ حنفی میں امام ابوحنیفہ کے دوشاگرد، صاحبین ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی ان

[1] سنن أبي داود، حديث:2625.

دونوں نے اپنے استاد کے اقوال اور فتاویٰ میں دو تہائی مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ دو تہائی مسائل اپنے شیخ کے نہیں مانے۔ تو کوئی مسئلہ بتاؤ فقہاء کے مابین جو اختلاف سے محفوظ ہو۔ اللہ کی ذات کے بارے میں بتا دو، اس کی صفات کے بارے ہی میں بتا دو۔ جب یہ قوم اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات اور افعال میں اختلافات اور تناقض کا شکار ہے تو مسائل کا کیا حال ہوگا۔ اور اللہ کیا فرما رہے ہیں: جہاں اختلاف ہو، وہاں اولی الامر کا پتا کٹ چکا ہے۔ اسے لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف، وہاں ایک ہی حل ہے، دوسرا کوئی حل نہیں اور کوئی فقہی مسئلہ متفق علیہ نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی اختلاف آپ کو ضرور ملے گا۔ ایک چیز میں اتفاق ہے بس اور وہ یہ ہے کہ اتفاق نہیں کرنا۔ اس میں اتفاق ہے۔ «اِتَّفَقُوا عَلٰى أَلَّا يَتَّفِقُوا» اس بات پر سارے فقہاء متفق ہیں کہ اتفاق ہم نے نہیں کرنا۔ ہمارے ایک عربی دوست تھے، ہم نیل الأوطار پڑھ رہے تھے۔ حدیث اوپر آ گئی، اس حدیث میں امام شوکانی نے جو مسائل اخذ کیے، ان کا ذکر کیا اور شروع ہوگیا: «قَالَ فَلَانٌ» فلاں نے یوں کہا، فلاں نے یوں کہاں۔ عربی دوست نے کہا: «مَاهٰذَا؟ فَهٰذَا طَبِيعَةُ الْفُقَهَاءِ» اس بات کو چھوڑ دو یہ تو فقہاء کا مزاج ہے کہ ہر بات میں اختلاف کرنا ہے۔ حدیث آ گئی، حدیث کا مدلول واضح ہو چکا ہے، یہ کافی ہے ہمارے لیے۔ اب فلاں نے کیا کہا، فلاں نے کیا کہا۔ اس کو چھوڑ دو۔ تو یہ آیت تحقیق کی طرف دعوت دے رہی ہے۔ کسی مسئلے میں اختلاف ہو، اگر قرآن کہتا ہے کہ اسے حل کروا اپنے فقہاء سے تو بات بن جاتی، لیکن نہیں، فقہا کا پتا کٹ چکا، اولی الامر کا پتا کٹ چکا۔ آپ نے تحریف کرکے اولی الامر کو داخل کیا، قرآن میں نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف کسی مسئلے کو لوٹانا تحقیق ہے یا تقلید۔ یہ آیت تقلید کی دلیل ہے یا

تحقیق کی دلیل ہے۔ یہاں تقلید کا رد ہو رہا ہے بڑے واشگاف الفاظ میں کہ تنازعات اور اختلافات میں کوئی حکم نہیں ہے اللہ اور اس کے رسول کے سوا۔ پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے:

«فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ، تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ»[1]

میرے بعد تم بڑے اختلافات دیکھو گے۔ کسی صحابی نے کوئی نکیر نہیں کی کہ رسول اللہ ﷺ ایسا کیسے ممکن ہے، اللہ کی وحی موجود ہے سورج کی طرح روشن، بھلا وحی کے ہوتے ہوئے اختلاف کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن صحابہ نے قبول کیا کہ اللہ کے پیغمبر کی خبر ہے اور اللہ کے پیغمبر الصادق المصدوق ہیں، چنانچہ اسے قبول کیا۔ حکم کیا ہے، اختلاف ہو جائے تو ہم کیا کریں؟ رسول اللہ ﷺ نے حل دیا۔ ہر چیز کو چھوڑ دینا «فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي» اور چمٹ جانا میری سنت کے ساتھ۔ یہ حل ہے۔ تو سنت کے ساتھ چمٹ جانا، اختلافات کا حل سنت سے معلوم کرنا، یہ تقلید نہیں بلکہ تحقیق ہے۔ اثباتِ تقلید نہیں بلکہ ترکِ تقلید کی دعوت ہے۔ کتاب و سنت سے مسائل معلوم کرنا یہ ترکِ تقلید ہے، اثباتِ تقلید نہیں۔ تو میں نے شروع میں عرض کی نا کہ جو دلائل اثباتِ تقلید میں پیش کیے جا رہے ہیں، جتنا ان پر غور کرو گے اتنا آپ پر واضح ہو گا کہ یہاں تو تقلید کہیں ہو ہی نہیں رہی۔

قرآن پاک کا ایک مقام: ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾[2] ہر بستی سے، علاقے سے کچھ لوگ نکلیں، ایک نکلے، دو نکلیں، چار نکلیں۔ سفر کریں علماء کی طرف، مدارس کی طرف اور کیا کریں: ﴿لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ دین میں تفقہ کریں، دین کی فقہ حاصل کریں۔ لفظ دین ذہن میں رکھنا اور پھر لوٹیں اپنی قوم کی طرف، ان کو آپ ڈرائیں،

[1] سنن أبي داود، حديث: 4607. [2] التوبة 9:122.

سمجھائیں، وعظ کریں۔ اس آیت کو بھی اثباتِ تقلید میں پیش کیا جاتا ہے کہ ہر گروہ سے کچھ لوگوں کا نکلنا کہ وہ ایک ہو، دو ہوں، چار ہوں، سفر کر کے جانا علماء کی طرف، مدارس کی طرف، پھر دین سیکھ کر آئیں اور آنے کے بعد اپنی قوم کو دعوت دیں تو ان کا جانا قرآن سے ثابت ہے اور ان کا آنا قرآن سے ثابت ہے، ان کا دعوت دینا قرآن سے ثابت ہے۔ تو اس دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں تو یہ سارا معاملہ عبث ہے اور اگر کریں تو یہ تقلید ہے۔ پہلی بات یہ کہ یہ عمومی بات ہے۔ جو محل نزاع ہے وہ یہ ہے کہ فرد واحد کی تقلید ثابت کرو، وہ ثابت نہیں ہو رہی۔ دوسری بات یہ کہ ہر گروہ سے کچھ لوگ نکلیں اور وہ کیا کریں ﴿لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ وہ دین کی فقہ حاصل کریں۔ دین کس چیز کا نام ہے؟ اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾[1] آج میں نے دین مکمل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے دین مکمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کیا اتارا ہے؟ ہدایہ، قدوری یا کنز الدقائق اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے۔ قدوری اتاری ہے؟ قدوری کو دین کہا ہے؟ اللہ فرماتا ہے: ﴿وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾[2] اللہ نے آپ پر قرآن و حدیث اتارا ہے، اسی کو دین کہا ہے اور اسی کے ساتھ دین کو مکمل کیا ہے اور یہ جماعت نکلے اسی دین میں تفقہ کے لیے، اسی دین کی فقہ حاصل کرنے کے لیے۔ فقہ کا معنی ہے، سمجھ۔ اور سمجھ نام ہی اسی چیز کا ہے جو کتاب و سنت سے حاصل ہو۔ تو یہ جماعت جو نکلتی ہے، وہ دین کی فقہ حاصل کرے۔ وہ دین جسے اللہ نے اتارا ہے۔ ﴿وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ وہ قرآن اور حدیث ہے۔ اللہ نے دین کی تکمیل کی۔ قرآن اور حدیث کو نازل کیا اور اسے مکمل کر دیا۔ یہ جماعت کیوں جائے؟ قرآن و حدیث سیکھنے کے لیے۔ قرآن و حدیث کی فقہ حاصل کرنے کے لیے۔ جب حاصل

[1] المآئدة 5:3. [2] النسآء 4:113.

کرکے آئے تو پھر قوم کو اسی کی دعوت دے۔ جو چیز سیکھی ہے، اسی کی دعوت دے۔ اور قوم ان کی بات کو سنے اور قبول کرے۔ اللہ کے عذاب سے ڈر جائے اور بچ جائے اور یہ سارا سلسلہ تحقیق پر ہے نہ کہ تقلید پر۔ دین کا تفقہ تقلید نہیں۔ اگر اس سے تقلید ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو جانے والی جماعت تو پھر محققین کی جماعت ہوئی نا اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ خواہ جانے والی جماعت ہو خواہ جو سن کے آ رہے ہیں وہ لوگ ہوں، سارے کے سارے ایک امام کی تقلید کا دم بھرتے ہیں۔ تو فرق کہاں سے کرو گے۔ نہیں، یہ قوم تفقہ فی الدین کرے اور دین قرآن و حدیث کا نام ہے، کتاب و سنت کا نام ہے۔ فقہ کا نام دین نہیں۔ اللہ نے جس دین کو مکمل کیا قرآن و حدیث کے ساتھ، کتاب و سنت کے ساتھ، یہی سیکھنا ہے، یہی حاصل کرنا ہے اور واپس لوٹنے کے بعد اس کی دعوت اپنی قوم کو دینی ہے اور یہ دعوت تحقیق ہے نا کہ تقلید۔ قوم کے سامنے پیش کرنا ہے کہ ہم نے قرآن پڑھا، ہم نے حدیث پڑھی۔ قرآن و حدیث کے ذریعے قوم کو ڈرانا ہے اور قوم نے اس قرآن و حدیث کو سننا ہے، اسی کو آ کر وہ پیش کرنے کے مکلّف ہیں اور دوسری بات: ہم دلائل سے اب تک یہ بات ثابت کر چکے کہ اگر وہ اپنی بات کریں گے بھی تو وہ قابل قبول نہیں ہے۔ «لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ» جو بھی بات ہوگی اسے قرآن و حدیث کی میزان پر پیش کیا جائے گا۔ مطابق ہے تو قابل قبول ہے، مخالف ہے تو قابلِ رد ہے۔ ﴿وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ [1] کہ ہم نے بہت سے امام بنائے جو لوگوں کی ہدایت کا کام کرتے ہیں۔ یہاں اماموں کا ذکر ہے اور ہم بھی اماموں کو پکڑے بیٹھے ہیں، ان کی تقلید کا نام لیتے ہیں۔ اللہ اکبر! ایک ہی لفظ پر غور کرلو: ﴿یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾

[1] الأنبیآء 21:73.

وہ لوگوں کی ہدایت کا کام کرتے ہیں ہمارے امر کے ساتھ اور اللہ کا امر اللہ کی وحی ہے اور اللہ کی وحی کے ساتھ لوگوں کی ہدایت کا کام کرنا تقلید نہیں۔ تقلید تو بلا حجت بات کو ماننے کا نام ہے۔ جس آیت سے تقلید ثابت کر رہے ہیں، اسی میں بامرنا کی تخصیص تقلید کی جڑیں کاٹ رہی ہے۔ ہمارے امر سے وہ لوگوں کی ہدایت کا کام کرتے ہیں اور اللہ کا امر اللہ کی وحی ہے، قدوری، کنز اور منیۃ المصلی نہیں ہے۔ اللہ کا امر اللہ کی وحی ہے، کتاب و سنت۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ» ”تمھارے بیچ دو امر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“ ان دو چیزوں کو اللہ کا امر کہا گیا ہے۔ «لَنْ تَضِلُّوا مَاتَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا» [1] جب تک ان کو پکڑے رکھو گے، گمراہ نہیں ہو گے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول، لہٰذا کتاب اللہ کا امر ہے، سنتِ رسول اللہ کا امر ہے۔ تو یہ ائمہ جو ہمارے امر سے لوگوں کی ہدایت کا کام کرتے ہیں تو وہ اللہ کی وحی پیش کرتے ہیں اور وحی کو پیش کرنا تقلید نہیں ہے۔ اور اللہ کے امر کو پیش کرنا اور اسے قبول کرنا یہ تحقیق ہے تقلید نہیں تو جس آیت کریمہ کو تقلید کے اثبات میں پیش کیا جا رہا ہے، تقلید اس سے کوسوں دور ہے۔ یہاں تو تقلید کا رد ہے کہ امام جو لوگوں کی ہدایت کا کام کرنے والے ہیں، وہ اللہ کے امر کو پیش کریں، کتاب و سنت کو پیش کریں اور قرآن و حدیث کو پیش کریں۔ قرآن پاک کا ایک اور مقام جس میں یہ ذکر ہے کہ یہ لوگ اس معاملے کو اللہ کے رسول پر پیش کیوں نہیں کرتے ﴿وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ [2] اور ان لوگوں کی طرف جو احکام کا استنباط کر کے بات کرتے ہیں، استنباط کر کے مسئلے کا حل پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان کی طرف معاملے کیوں نہیں لوٹاتے؟ ﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ

[1] الموطأ للإمام مالك، حديث: 3338. [2] النسآء 4:83.

اَذَاعُوْا بِهٖ﴾ جب ان کے پاس خوف یا امن کی کوئی خبر آتی ہے تو بلا سوچے سمجھے اس کو بیان کرتے ہیں، اس کی تشہیر کرتے ہیں، اس کو یہ لوٹاتے کیوں نہیں اللہ کے رسول کی طرف اور ان لوگوں کی طرف جو استنباط کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تاکہ انھیں حق معلوم ہو اور اپنی طرف سے کسی خبر کی تشہیر نہ کریں۔ اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ لوگ دو طرح کے ہیں کہ جن کے پاس معاملے آتے ہیں، ان میں کچھ جاہل ہوتے ہیں، ان کو معاملے کی خبر نہیں ہوتی، اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا تو وہ لوگ پیش کریں اللہ کے رسول کی طرف جو کہ اب موجود نہیں ہیں تو پھر اب اولو الامر باقی رہ جاتے ہیں، ان کی طرف پیش کریں جن میں استنباط کی صلاحیت ہے تاکہ وہ استنباط کر کے، اس فتنے اور مسئلے کا حل پیش کر کے اسے سلجھا دیں اور کہتے ہیں کہ سارا تقلید کا شاخسانہ ہے۔ ہرگز یہ تقلید نہیں ہے۔ اس آیت سے تقلید کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا شانِ نزول کیا ہے؟ اس تناظر میں غور کیجیے۔ نبی کریم ﷺ نے تمام بیویوں سے اِیلا کیا تھا۔ قسم کھائی کہ میں تمھارے قریب نہیں جاؤں گا۔ اور یہ ایلا دورِ جاہلیت میں طلاق شمار ہوتا تھا۔ جب صحابہ نے ایلا کا سنا تو وہ سمجھے کہ آپ ﷺ نے اپنی تمام بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اب انھوں نے اس خبر کی تشہیر شروع کر دی، آگے بیان کرنے لگے۔ خبر پھیل گئی حتی کہ سیدنا عمر بن خطاب ؓ جو مدینہ سے بہت دور رہتے تھے، تین چار میل کے فاصلے پر عوالی میں رہتے تھے، ان تک یہ بات پہنچ گئی۔ پریشان ہو کر مدینہ میں آ گئے۔ ان کی بیٹی سیدہ حفصہ نبی ﷺ کی بیوی تھیں۔ پریشان ہوئے کہ میری بیٹی نے اللہ کے نبی کے ساتھ ایسا کیا کام کیا کہ آپ نے اسے طلاق دے دی۔ سیدھا اللہ کے رسول کے پاس گئے اور سوال کیا: «أَطَلَّقْتَ نِسَاءَ كَ» کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق

دے دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا» میں نے طلاق نہیں دی بلکہ ایلا کیا ہے۔ ایک مہینہ ان کے قریب نہ جانے کا عزم کیا ہے، طلاق نہیں دی۔[1] سیدنا عمر ؓ باہر آ گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم نے اس خبر کو سنا اور بلا سوچے سمجھے تشہیر کر دی کہ اللہ کے پیغمبر نے طلاق دی ہے۔ تم نے اس کو اللہ کے پیغمبر کی طرف کیوں نہیں لوٹایا، وہ سامنے موجود تھے۔ ان سے پوچھتے جیسے عمر ؓ نے پوچھا۔ تم نے بیان کیوں کر دیا۔ ان سے نہ پوچھتے تو چلو ان صحابہ سے پوچھ لیتے جو اچھی رائے والے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ تم نے کیوں نہ پوچھا! اور آگے بیان بھی کر دیا: امیر عمر ؓ فرماتے ہیں: «أَنَا الَّذِي اسْتَنْبَطْتُّ» جو قرآن نے کہا کہ تم نے مسئلے کو ان کی طرف کیوں نہ لوٹایا جن میں استنباط کی صلاحیت ہے، سیدنا عمر ؓ فرماتے ہیں کہ استنباط کرنے والا اس وقت میں تھا۔ میں نے وہ استنباط کیا۔ استنباط کیسے کیا؟ اس مسئلے کو اللہ کے پیغمبر کی طرف لوٹا کر۔ یہ تحقیق ہے یا تقلید ہے۔ یہاں تقلید کہاں ثابت ہو رہی ہے؟ اشارہ ایک خاص واقعے اور قصے کی طرف ہے۔ چلو اسے عموم کا رنگ دے سکتے ہیں کہ کوئی فتنہ آ جائے، قضیہ آ جائے، اسے آپ لوٹائیں اللہ کے رسول کی طرف۔ اللہ کے رسول نہ ہوں تو ان کی احادیث ہیں، لیکن پہلے اطاعتِ رسول ہے۔ اگر اللہ کے پیغمبر کی احادیث سے بات حل نہیں ہو رہی تو علماء ہیں جو صاحب الرائے ہیں، ان سے پوچھ لو، لیکن ان سے سوال کیسے کرنا ہے؟ اس کے لیے اہل الذکر کی قید موجود ہے جو اللہ کی وحی سے جواب دے سکیں، ان سے پوچھو۔ اور یہ پوچھنا تقلید نہیں بلکہ تحقیق ہے۔ تو اول تو یہ آیت کریمہ ایک خاص واقعے سے متعلق ہے اور دوسری بات کہ اگر اس میں عموم آ بھی جائے تو استنباط کیا گیا ہے کہ جو استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان سے پوچھو۔ اور استنباط دلائل

[1] صحيح البخاري، حديث:2469.

سے ہوتے ہیں اور دلائل سے استنباط کرنا تقلید نہیں بلکہ تحقیق ہے۔ تقلید کا ایک ہی مطلب ہے، حجت کے ساتھ کسی کی بات کو نہیں ماننا۔ اب قرآن کی جو یہ ساری نصوص ہیں جن کو اثباتِ تقلید میں پیش کیا جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں ان سے کہیں سے تقلید ثابت نہیں ہو رہی۔ جس قدر آپ مطالعہ کرتے جائیں گے، اسی قدر واضح ہو گا کہ تقلید کی تردید تو ہو رہی ہے، اثبات نہیں ہو رہا۔ بہت سی احادیث بھی ہیں جنھیں میں دوسری قسط کے لیے چھوڑتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے سچے دین کا صحیح فہم عطا فرما دے اور ہمیں سلف و صالحین کا ذوق عطا فرما دے، کتاب و سنت کی تباع والا۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا۔ پورے قرآن اور احادیث میں سیکڑوں مقامات پر اتباع کا اور اطاعت کا حکم ہے۔ تقلید کا لفظ پوری شریعت میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ایسے لفظ پر دوستوں کے پورے دین کی بنیاد ہے جو لفظ پورے قرآن میں کہیں ہے نہ پوری احادیث میں کہیں ملتا ہے۔ ایک جگہ اس کا ذکر ملتا ہے اور وہ ہے تقلید، قلادہ سے، یعنی جانور کے گلے میں پٹا ڈالنا، باقی جس معنی میں اسے لیا جا رہا ہے اور پورا دین قرار دیا جا رہا ہے، اس معنی میں کتاب وسنت میں یہ لفظ کہیں ثابت نہیں ہے۔ ایک اور حجت شاہ ولی اللہ کا قول کہ چار صدیوں تک تقلید کا کوئی وجود نہیں تھا۔ چار صدیوں کے بعد تقلید آئی: «لَنْ يَكُونُوا مُجْتَمِعِينَ عَلَى التَّقْلِيدِ الْخَالِصِ لِمَذْهَبٍ مُعَيَّنٍ» کہ چوتھی صدی ہجری تک لوگ کسی معین مذہب کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ چار صدیوں کے بعد تقلید آئی۔ ہمارا یہ سوال کہ چار صدیوں کے بعد جو مسئلہ آتا ہے، اس کو دین کہا جا سکتا ہے؟ یہاں لوگ شد و مد سے اجماع کی بات کرتے ہیں کہ چار صدیوں بعد تقلید پر امت کا اجماع ہو چکا ہے اور اجماع

شرعی دلیل ہے۔ ہم اس کو نہیں مانتے، پہلے ہمیں مطمئن کرو کہ اجماع کیا ہے؟ امت کا اجماع، یہ کیا چیز ہے؟ امت تو ساری دورِ صحابہ سے لے کر قیامت تک ہے۔ یہ ساری امت اجماع کیسے کر سکتی ہے؟ کچھ لوگ جا چکے، کچھ موجود ہیں، کچھ آئندہ آئیں گے، یہ کہاں اکٹھے ہو کر اجماع کریں گے اور اگر کہو کہ یہ ایک زمانے کے اجماع کا نام ہے، کیونکہ صحابہ کا دور تنزیل وحی کا دور تھا، اس دور میں دین مکمل ہو گیا اور تکمیل دین کے بعد کوئی نئی چیز دین نہیں بن سکتی۔ ایک معین شخص کی تقلید کا حکم بھی ہوتا ہے؟ لیکن بقول تمھارے چار صدیوں تک فردِ معین کی تقلید کا نام تک نہ تھا۔ چار سو سال کے بعد یہ نام آیا تو تکمیل دین کے چار سو سال بعد ایک مسئلہ آئے جو قرآن میں نہیں ہے، حدیث میں نہیں ہے تو یہ تکمیل دین پر اعتراض نہیں ہے؟ یہ اجماع کیسے بنتا ہے؟ اجماع شرعی دلیل ہے، لیکن اجماع کی حقیقت تو بیان کرو اور کیا یہ جائز ہے کہ تکمیل دین کے بعد ایک نئی چیز پر امت اجماع کر کے اس کو دین میں داخل کر دے۔ تم نے اس بات کو قبول کیا کہ چار سو سال تک تقلید کا نام و نشان نہیں تھا، پھر چار سو سال بعد فردِ معین کی تقلید اجماع سے ثابت ہو رہی ہے، تو ایسے اجماع کی کیا حقیقت ہے جو دین میں ایسی چیز ڈال دے جو دین میں ہے ہی نہیں۔ کتاب وسنت میں ہے ہی نہیں اور اللہ کا دعویٰ ہے کہ ہم نے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ یہ تقلید، تکمیل دین کے دعوے پر اعتراض ہے۔ امام مالک ؒ نے صحیح فرمایا ہے: «مَالَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ دِينٌ لَا يَكُونُ الْيَوْمَ دِينًا» جو چیز اس دور میں دین نہیں تھی، وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔ «لَا يَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا مَا صَلُحَ بِهِ أَوَّلُهَا» اس امت کے آخری دور کو وہی چیز سنوار سکتی ہے جس نے اس امت کے پہلے دور کو سنوارا تھا اور اصلاح کی تھی اور وہ

صحابہ کا دور تھا۔ صحابہ کے دور میں تقلید نام کی کوئی چیز نہیں تھی، تقلید کے جمود سے وہ قطعاً آگاہ نہیں تھے، کتاب وسنت تھی، قرآن وحدیث تھا، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تھی۔ اللہ ہمیں بھی اس پر قائم ودائم رکھے۔

«وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهِ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ»

صحیح بخاری کی آخری حدیث پر درس

(عالمانہ، محققانہ اور فاضلانہ خطاب)

صحیح بخاری کی آخری حدیث پر درس

(عالمانہ، محققانہ اور فاضلانہ خطاب)

خطبہ مسنونہ:

أَمَّا بَعْدُ: فَقَدْ قَالَ أَمِيرُ الدُّنْيَا فِي الْحَدِيثِ الْإِمَامُ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيُّ رحمه الله بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ وَأَنَّ أَعْمَالَ بَنِي آدَمَ وَقَوْلَهُمْ يُوزَنُ وَقَالَ مُجَاهِدٌ: اَلْقُسْطَاسُ: اَلْعَدْلُ بِالرُّومِيَّةِ وَيُقَالُ: الْقِسْطُ مَصْدَرُ الْمُقْسِطِ وَهُوَ الْعَادِلُ، وَأَمَّا الْقَاسِطُ فَهُوَ الْجَائِرُ. حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ إِشْكَابٍ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ عَنْ عُمَارَةَ بْنِ الْقَعْقَاعِ، عَنْ أَبِي زُرْعَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: كَلِمَتَانِ حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ، خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ.

عزیز طلبہ اور قابل احترام سامعین حضرات! محترم اساتذہ کرام! مہمانان گرامی!

علمائے کرام! یہ بات سامنے رکھتے ہوئے کہ موسم کی صورت حال غیر واقعی ہے اور مجھے بھی بقول مولانا داود صاحب کچھ ناسازیِ طبیعت کا عارضہ لاحق ہے۔ اختصار سے کسی تمہید کے بغیر چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ صحیح بخاری کا آخری باب آپ نے سن لیا۔ جو محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہمارے اس طالب علم نے اپنے آپ سے لے کر نبی ﷺ تک پوری سند کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ ہماری انفرادیت اور خصوصیت ہے، ہماری ہر بات سند کے ساتھ ہے۔ «اَلْإِسْنَادُ مِنَ الدِّينِ وَلَوْلَا الْإِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ» [1] سند دین کا حصہ ہے اور اگر سند نہ ہوتی تو ہر شخص اپنی مرضی سے جو چاہتا، کہتا۔ یہ قول عظیم محدث عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا ہے۔ یہ جو باب آپ نے سنا ہے اس میں قیامت کی ایک خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن سارے بندوں کے اعمال تولنے ہیں۔ اور یہ باب جس کتاب سے متعلق ہے وہ صحیح بخاری کی آخری کتاب، کتاب التوحید ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی یہ فقاہت ہے کہ انھوں نے کتاب التوحید پر اس علمی سفر کا اختتام کیا۔ یہ ذہن دینے کے لیے کہ ویسے تو توحید ہر لمحہ اور ہر لحظہ بندے کی ضرورت ہے، لیکن ہر شخص اپنے خاتمے کی فکر کرے کہ اس کا خاتمہ توبہ اور توحید خالص پر ہو۔ یہ کامیابی کی اساس ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ» [2] جس شخص کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوگا، وہ جنتی ہے۔ لیکن صرف کلام کافی نہیں ہے، پڑھ لینا کافی نہیں ہے۔ اور یہ بات پورے وثوق سے نوٹ کرلو کہ تمھارے ہاتھوں میں دس لاکھ دانے کی تسبیح ہو اور روزانہ لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے رہو، اس کا کوئی نفع نہیں ہے جب تک اس

[1] معرفة علوم الحديث للحاكم، رقم: 8، و صحيح مسلم، مقدمه، رقم: 32. [2] سنن أبي داود، حديث: 3116.

کلمے کا معنی معلوم نہ ہو، اس کے ارکان کا علم نہ ہو، اس کی شرائط معلوم نہ ہوں۔ تبھی تو صحیح مسلم کی ایک حدیث میں نبی ﷺ کا یوں فرمان منقول ہے کہ «مَنْ مَّاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ» [1] کہ جس شخص کی موت اس طرح آئے کہ اسے لا الہ الا اللہ کا علم ہو، یہ خالی پڑھنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کلمے کا علم ہو، وہ جنتی ہے۔ مسند احمد اور کتب سنن وغیرہ کی حدیث ہے، قیامت کے دن ایک شخص کو حساب کتاب کے لیے پکارا جائے گا۔ اس کے دامن میں گناہوں کے ننانوے دفتر (رجسٹر) ہوں گے۔ دفاتر کا سائز ہماری دنیا کے رجسٹروں کا سائز نہیں ہے بلکہ «كُلُّ سِجِلٍّ مِّثْلُ مَدِّ الْبَصَرِ» ہر رجسٹر تا حدنگاہ ہوگا۔ اس کی لمبائی، چوڑائی اور اس کا حجم تا حدنگاہ ہوگا۔ اور سب گناہوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ شخص گرتا پڑتا آئے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہمارے پاس اس کی ایک نیکی ہے، چنانچہ ایک چھوٹی پرچی پیش کی جائے گی۔ یہ اس کی نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے سے کہے گا: میرے بندے! اپنا وزن خود جا کر دیکھ۔ ہمارے ترازوؤں میں تیرے اعمال تولے جا رہے ہیں، تو خود جا کر دیکھ لے۔ بندہ مایوسی پر قائم ہوگا اور کہے گا: «اَلْبِطَاقَةُ مَعَ هٰذِهِ السِّجِلَّاتِ» یا اللہ! نتیجہ تو سامنے نظر آ رہا ہے۔ گناہوں کے ننانوے دفتر ہیں اور اس کے مقابلے میں نیکی کی ایک پرچی ہے۔ یہ چھوٹی سی پرچی ان دفاتر کا کیا مقابلہ کرے گی؟ اللہ پاک حکم دے گا کہ تم جاؤ اور اپنا وزن خود دیکھو۔ اور یہ وزن «عَلٰى مَشْهَدِ الْخَلَاقِ» ہوگا۔ دنیا دیکھے گی۔ انسان، فرشتے اور جن سبھی دیکھ رہے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب وزن ہوگا «فَطَاشَتِ السِّجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ» پرچی بھاری پڑ جائے گی اور

[1] صحيح مسلم، حديث: 26.

وہ ننانوے دفتر ہلکے پڑ جائیں گے۔ بلکہ گناہوں کا پلڑا اتنا اونچا چلا جائے گا کہ ان دفاتر کے گرنے کا خدشہ پیدا ہو جائے گا۔ پوری دنیا کے سامنے اس پرچی کو کھولا جائے گا۔ اس میں اس کی کون سی نیکی ہے جو لاکھوں گناہوں پر غالب آ گئی۔ «فِيهَا أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» جو نیکی درج ہے وہ ہے «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ [1] یہی بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا کلمہ «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» قبول نہیں کیا، پڑھنا قبول نہیں کیا بلکہ اس کلمے کی گواہی قبول کی ہے۔ پڑھنا اور ہے اور گواہی دینا اور ہے۔ پڑھنے میں علم ضروری نہیں ہے لیکن گواہی مکمل علم کے ساتھ ہے۔ جس چیز کی گواہی آپ دینا چاہ رہے ہیں اس کا آپ کو علم نہ ہو تو وہ غیر معتبر ہے، عبث ہے۔ دنیا کے کسی کام کے تعلق سے آپ کو گواہی دینے کے لیے عدالت جانا پڑے تو اس حوالے سے جج اور وکیل آپ پر جرح کر دیں گے۔ اس مسئلے کے تعلق سے آپ کا علم جانچتے ہیں اور سوالات کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، حالانکہ دنیا کے امور ہیں۔ اور یہ گواہی کائنات کی سب سے بڑی گواہی ہے۔ یہ بغیر علم کے کیسے معتبر ہوگی؟ اس کا کلمہ پڑھنا قابل قبول نہیں تھا بلکہ اس کلمے کی گواہی قابل قبول تھی۔ اور گواہی علم کے ساتھ ہے۔ اس لیے احادیث میں اس کلمے کے پڑھنے کی بہت سی شرائط ہیں۔ «مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ» [2] اس کا کلمہ قابل قبول ہے جو یقین کے ساتھ پڑھے۔ جو اس کلمے کا مضمون اور موضوع ہے، اسے یقین کے ساتھ وہ قبول کرے، اور «صَادِقًا مِّنْ قَلْبِهِ» [3] کے الفاظ بھی ہیں کہ پوری سچائی کے ساتھ پڑھے، «غَيْرَ شَاكٍّ فِيهِمَا» [4] کے الفاظ بھی ہیں کہ اس کلمے کی گواہی میں

[1] جامع الترمذي، حديث: 2639. [2] صحيح مسلم، حديث: 31. [3] مسند أحمد: 16/4.
[4] صحيح مسلم، حديث: 27.

کوئی شک نہ ہو۔ «خَالِصًا مِّنْ قَلْبِهِ» [1] کے الفاظ بھی ہیں کہ اپنے دل سے خالص ہوکر پڑھے۔ تو خالص ہوکر پڑھنا، پوری سچائی کے ساتھ پڑھنا، پورے یقین کے ساتھ پڑھنا اور کسی قسم کا شک نہ ہونا، یہ ساری چیزیں علم کا تقاضا کرتی ہیں۔ بغیر علم کے یہ چیزیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے لا الہ الا اللہ کے تعلق سے سب سے اہم نکتہ یہ ساتھ لے کر جائیے گا کہ یہ عظیم گواہی بغیر علم کے قابل قبول نہیں۔ اسی لیے ہمارے پروردگار نے اپنی توحید کے لیے تین گواہ پیش کیے ہیں کہ میں اکیلا ہوں، اکیلا معبود برحق، میرے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ اور اس کے تین گواہ ہیں: ایک خود اللہ رب العزت، دوسرے اللہ کے فرشتے اور تیسرے اولوالعلم ہیں، وہ بندے جو صاحب علم ہیں۔ جن کے سینوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نورِ وحی سے منور کررکھا ہے۔ انھیں یہ سعادت دی گئی کہ وہ اللہ کی توحید کے گواہ ہیں۔ تو کس قدر یہاں علم کی ضرورت ہے۔ اور کس قدر علم کا احتیاج ہے۔ ﴿اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ [2] ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ [3] کہ سب سے پہلے لا الہ الا اللہ کا علم حاصل کرو اور اس کے بعد صرف ایک دفعہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلو، اللہ تعالیٰ اس ترتیب سے ایک لمحے کے اندر تمھارے سو سال کے گناہ معاف کردے گا۔ پس توحید کی اساس اور بنیاد چاہیے۔

امام بخاری ؒ نے کتاب التوحید پر اپنے اس علمی سفر کا اختتام فرمایا ہے۔ اور یہ تنبیہ کی ہے کہ بہرحال تمھارا عمر کا آخری حصہ توحید پر قائم ہونا ضروری ہے۔ «وَإِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ» [4] سارے اعمال کا جو مدار ہے وہ انسان کے خاتمے پر ہے۔ اور خاتمہ اگر اللہ کی توحید پر ہے پورے علم اور معرفت کے ساتھ تو یہ کامیابی کی سب

[1] صحيح البخاري، حديث: 99. [2] الزخرف 43:86. [3] محمد 47:19. [4] صحيح البخاري، حديث: 6607.

سے قوی اساس ہے۔ کتاب التوحید آپ طلبہ نے پڑھی ہے اور یہ بات آپ جانتے ہیں کہ اس کا موضوع توحید کی ایک خاص قسم ہے اور وہ ہے توحید اسماء وصفات۔

توحید کی تین قسمیں ہیں: ایک توحید ربوبیت، دوسری توحید الوہیت اور تیسری توحید اسماء وصفات۔ توحید ربوبیت تین چیزوں کا نام ہے، تین چیزوں کو کماحقہ ماننا یہ توحید ربوبیت ہے: ① اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔ ② اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا مالک ہے۔ ③ اللہ تعالیٰ ہی کا امر اور تصرف ان چیزوں پر قائم ہے۔ جو حرکت اس کائنات میں ہو رہی ہے، وہ اللہ کے امر سے ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ان تین چیزوں کی معرفت، یہ توحید ربوبیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ان میں کوئی شریک نہیں ہے۔ خالق اللہ ہے، مالک اللہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی ایک ذرے کا خالق نہیں۔ اور اللہ کے سوا کوئی ایک کھجور تو کیا اس کی گٹھلی اور گٹھلی تو کیا اس کے اندر باریک سا چھلکا ہوتا ہے، اس کا بھی مالک نہیں ہے۔ جن کو اللہ کے سوا تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی نہیں بنا سکتے۔ بلکہ کوئی مکھی اگر ان کی کوئی چیز لے اڑے، اسے چھڑا نہیں سکتے۔ انھیں معلوم نہیں کہ وہ کتنا جئیں گے، کب مریں گے، کب اٹھیں گے۔ تو اللہ رب العزت ہی خالق اور مالک ہے اور اسی کا امر چلتا ہے۔ دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی۔

اس کے امر کی تین قسمیں ہیں: ایک امر شرعی ہے، جیسے ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ [1]، ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [2] یہ سب احکام شرعیہ جو اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ کسی غیر اللہ کو ایک سوئی کی نوک کے برابر بھی شریعت میں دخل اندازی کا حق حاصل نہیں ہے۔ دوسری قسم امر قدری وکونی ہے۔ یعنی تقدیر کے سارے احکام اللہ کے

[1] البقرة 2:43. [2] محمد 47:19.

پاس ہیں، اللہ نے تقدیر لکھی ہے ہر بندے کی، ہر مخلوق کی۔ اور کوئی مخلوق ایک ذرے کے برابر بھی اس امر قدری وکونی میں کوئی اختیار نہیں رکھتی۔ اور تیسری قسم امر جزائی کی ہے کہ قیامت کے دن فیصلے بھی اللہ نے کرنے ہیں۔ یہ سارے فیصلے اللہ کے پاس ہیں۔ پوری کائنات کے فیصلے وہی فرمائے گا۔ ان تینوں اوامر میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ سب توحید ربوبیت ہے۔ اور اس کی کچھ باتیں توحید الوہیت سے منسلک ہیں۔

اور توحید الوہیت جو دوسری قسم ہے، جس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود حق ہے۔ باقی سارے معبود باطل ہیں۔ کچھ زندہ، کچھ مردہ، حجر اور شجر اور کسی نے فرشتوں کو پکارا اور کسی نے جنوں کو پکارا، یہ سب باطل ہیں۔ معبود حق صرف ایک اللہ ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾ [1] کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو جو تمھارا خالق ہے۔ یہ توحید الوہیت ہے۔

تیسری قسم توحید اسماء وصفات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیارے نام اور اس کی صفات۔ امام بخاری ﷫ کے دور میں گمراہ فرقوں نے زیادہ تر انحراف، توحید کی تیسری قسم میں پیدا کیا تھا۔ توحید اسماء وصفات میں۔ اس لیے اس کتاب التوحید کا پورا موضوع اللہ رب العزت کے اسماء وصفات ہیں۔ چونکہ اس دور میں بہت سے گمراہ فرقوں نے اس قسم میں الحاد، انحراف اور دجل وفریب قائم کر دیا تھا۔

سب سے پہلے آپ سن لیں کہ اسماء وصفات کی توحید کے بارے میں ہم اہل الحدیث کا موقف کیا ہے؟ ہم اہل الحدیث کا موقف اور عقیدہ، اسماء وصفات کے تعلق سے دو نکتوں، دو چیزوں اور دو ستونوں پر قائم ہے۔ ایک ستون ہے اثبات، ثابت کرنا۔ دوسرا

[1] البقرة 21:2.

ہے تنزیہ، یعنی کسی کو پاک کرنا، نفی کرنا اور انکار کرنا۔ یہ دو ستون ہیں توحید اسماء وصفات کے۔ اثبات کا معنی یہ ہے کہ ہر کمال کی خوبی اللہ کے لیے ثابت ہے۔ ہر وہ صفت جس میں کمال ہے وہ اللہ پاک کے لیے ثابت ہے۔ اس کو ثابت کرنا ہمارا عقیدہ ہے۔ اور وہ تمام صفاتِ کمال جو اللہ تعالیٰ نے خود یا اس کے رسول نے بیان فرما دی ہیں۔ ہمارا اس پر ایمان ہے۔ یہ ہے اثبات، توحید اثبات۔ تنزیہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ اس کی کسی صفت میں کوئی نقص نہیں ہے، کوئی عیب اور کمی نہیں ہے۔ تو یہ دو ستون ہیں توحید اسماء وصفات کے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء وصفات پر ایمان لانے کے لیے دو حکم دیے ہیں: ﴿وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ﴾ [1] دو حکم ہیں ایک ﴿فَادْعُوهُ بِهَا﴾ کہ اللہ تعالیٰ کو ان ناموں کے ساتھ پکارو جو اللہ کے لیے کتاب وسنت میں ثابت ہیں۔ وہ سارے نام، وہ ساری صفاتِ کمال ان کے ساتھ پکارو۔ یہ پہلا حکم ہے۔ اور دوسرا ان لوگوں کو چھوڑ دو جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد کھڑا کیا، ان کو چھوڑ دو۔ یہ بھی حکم ہے۔ معنی اللہ رب العزت کی صفاتِ کمال کو پہچاننا ضروری ہے تاکہ اس کو پکارا جا سکے اور ملحدین کے الحاد کی معرفت بھی ضروری ہے تاکہ ان کو چھوڑا جا سکے۔ دونوں حکم ہیں۔ ان ناموں کے ساتھ پکارو جو ثابت ہیں اور جو ملحدین ہیں ان کو چھوڑ دو۔ تو چھوڑنا تبھی ممکن ہوگا جب ان کو پہچانا جائے۔ اب توحید اسماء وصفات کے دو ستون ہیں ایک اثبات دوسرا تنزیہ ان دونوں ستونوں میں ملحدین کا الحاد کیا ہے؟ انھوں نے کس طرح الحاد کیا؟ کچھ لوگوں نے ستونِ اثبات کو لیا، یعنی جو نام اللہ کے لیے ثابت ہیں ان کو لیا

[1] الأعراف 180:7.

اور مانا لیکن مانا تشبیہ کے ساتھ۔ یہ ساری صفات برحق ہیں اور ہمارا ان پر ایمان ہے مگر یہ ساری صفات مخلوق کی صفات کے مشابہ ہیں۔ یہ ایک الحاد ہے۔ ان کے مغالطے کی اساس کیا ہے؟ اساس یہ ہے کہ لفظی اشتراک ہے۔ اللہ تعالیٰ سمیع ہے، سنتا ہے۔ انسان بھی سنتا ہے۔ تشبیہ قائم ہوگئی۔ حالانکہ وہ ایک قطعی نص سے غافل ہوگئے۔ اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [1] اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ وہ تشبیہ سے پاک ہے، اس کی ذات بھی، اس کی صفات بھی اور اس کے افعال بھی۔ مگر وہ تشبیہ کے قائل بن گئے۔ یہ ایک الحاد کی صورت ہے۔ کتنا بڑا کفر کہ وہ خالق کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ بھلا کوئی تشبیہ بنتی ہے؟ خالق کہاں اور مخلوق کہاں! مخلوقات کی ذاتیں آپس میں نہیں مل پاتیں۔ ایک ہاتھی کی ذات ہے اور ایک چیونٹی کی ذات ہے۔ دونوں مخلوق ہیں، کیا ہاتھی اور چیونٹی مشابہ ہیں؟ حالانکہ دونوں مخلوق ہیں، لیکن ان کی صفات مشابہ نہیں ہیں، مثلاً یوں کہا جائے: ہاتھی کی ٹانگ، یہ ہاتھی کی صفت ہے اور چیونٹی کی ٹانگ یہ چیونٹی کی صفت ہے۔ کیا دونوں صفات مشابہ ہیں۔ حالانکہ لفظی اشتراک موجود ہے۔ ٹانگ دونوں کی ہے لیکن مشابہت نہیں ہے۔ آپ نے سوئچ آن کیا، بتی جل گئی۔ اس کی روشنی موجود ہے۔ اس بتی کا نور موجود ہے۔ اور دن میں سورج کا نور۔ نور یہ بھی ہے اور نور وہ بھی ہے۔ لفظی اشتراک ہے۔ کیا آپ کی اس بتی کا نور اور سورج کا نور برابر ہے؟ مخلوقات میں تشبیہ نہیں تو خالق ومخلوق کیسے مشابہ ہوسکتے ہیں؟ اس لیے ہم اہل الحدیث کا اثبات کے تعلق سے موقف ہے «إِثْبَاتٌ بِلَا تَشْبِيهٍ» اور ملحدین کا الحاد ہے «إِثْبَاتٌ بِتَشْبِيهٍ» اور ہمارا عقیدہ اثبات بلا تشبیہ ہے کہ

[1] الشوریٰ 11:42.

اللہ رب العزت کی ساری صفات جو کتاب وسنت میں موجود ہیں، ثابت ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے اور ایمان ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی صفت میں مخلوق کی کسی صفت کے مشابہ نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے؟ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [1] اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں پر ہم نے اثبات کے تعلق سے صحیح عقیدہ پہچان لیا اور ایک گمراہ فرقے کا الحاد بھی پہچان لیا۔ ہمارا عقیدہ کیا ہے؟ اثبات بلا تشبیہ کہ اللہ رب العزت کی ساری صفات جو کتاب وسنت میں ثابت ہیں، وہ برحق ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے اور کسی صفت میں ہمارا پروردگار مخلوقات کی کسی صفت کے مشابہ نہیں ہے۔ اور یہ رد ہے مُشَبِّهَه پر جو تشبیہ کے قائل ہیں۔ یہ ان کا الحاد ہے، ہم ان کا انکار کرتے ہیں، اس گمراہ فرقے کو چھوڑتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ملحدین کو چھوڑ دو۔ ہم ان کو چھوڑتے ہیں۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

دوسرا ستون تنزیہ کا ہے۔ تنزیہ کا معنی ہے کہ اللہ رب العزت ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ ہم تنزیہ کے قائل ہیں۔ اس کی ذات اور صفات میں کوئی نقص اور کوئی عیب نہیں ہے۔ اور اس کو نقص اور عیب سے پاک قرار دینے کا ادب یہ ہے کہ ایک تو اس عیب کی نفی کریں اور دوسرا اس عیب کے مقابلے میں جو صفت کمال بنتی ہے، اس کو ثابت کریں۔ اللہ کی ذات کے بارے میں یہ حسن ادب ہے، مثلاً: ﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ [2] تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ظلم کرنا عیب ہے۔ حدیث قدسی ہے: «يَا عِبَادِي! إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوا» [3] اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کر دیا، ظلم اللہ نے حرام کیوں

[1] الشوریٰ 11:42. [2] الکھف 49:18. [3] صحیح مسلم، حدیث:2577.

کیا، اس لیے کہ ظلم صفت مدح نہیں ہے بلکہ صفت مذمت ہے، صفت عیب ہے۔ اللہ رب العزت ہر مذمت اور ہر عیب سے پاک ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا۔ اور اس صفت کی نفی کا ادب یہ ہے کہ جو صفت کمال اس کے مقابلے میں ہے، اس پر ہم ایمان کا ذکر کریں۔ ظلم کے مقابلے میں عدل ہے۔ اب پورا عقیدہ یوں بنے گا کہ اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ عدل ہی کرتا ہے۔ یہ ادب ہے صفات عیب کی نفی کا۔ اللہ تعالیٰ کو موت نہیں آتی اور موت کے مقابلے میں حیات ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے لیے دائمی حیات ہے۔ دائمی حیات، یعنی ایسی حیات جو ہر نقص اور ہر عیب سے پاک ہے۔ یہ تنزیہ ہے کہ صفات نقص سے اللہ تعالیٰ کو پاک کرنا۔ تنزیہ میں بھی بہت سے گمراہ فرقوں نے الحاد داخل کر دیا۔ بہت سے گمراہ فرقے، چونکہ انھیں چھوڑنے کا حکم ہے تو انھیں پہچاننا ضروری ہے کہ تنزیہ میں گمراہ جماعتوں نے، فرقوں نے کس طرح الحاد کھڑا کیا؟ اس میں پہلا فرقہ جہمیہ کا ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کرنا چاہی، لیکن تنزیہ کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا انکار کر بیٹھے۔ ان کا عذر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اگر مان لیں جیسے مُشَبِّهَه نے مانا تو تشبیہ لازم آئے گی۔ لہٰذا تشبیہ کے عذر سے بچاؤ کے لیے صفات کا انکار ہی کر دو۔ ذات موجود ہے لیکن بغیر صفات کے۔ ذات پر ایمان ہے صفات پر ایمان نہیں ہے۔ صفات اگر مان لیں تو تشبیہ لازم آئے گی۔ جب انھوں نے تنزیہ کا پہلو اختیار کیا اور تنزیہ میں تعطیل پیدا کر دی، یعنی اللہ رب العزت کی صفات کا انکار کر دیا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ ذات تو صفات کے ساتھ بنتی ہے۔ ذات کی تکمیل صفات کے ساتھ ہے۔ اگر صفات نہیں مانو گے تو ذات پر ایمان کیسے ثابت ہوگا؟ اور ذات کو کیسے مانو گے؟ ہر ذات صفات

کے ساتھ ہی ہے۔ آپ دیکھ لیں! ہر ذات کو لے لیں، ہر ذات صفت کے ساتھ ہے۔ اپنی صفات کے ساتھ بنتی ہے۔ بقول حماد بن زید ﷫ کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرے گھر کے صحن میں کھجور کا درخت ہے۔ اب یہ جہمیہ کی مثال ہے۔ میرے گھر کے صحن میں کھجور کا درخت ہے۔ اس سے سوال کرو: اس کا پھل کیسا ہے؟ تو جواب دیتا ہے کہ پھل اس کا نہیں ہے۔ پتے کیسے ہیں؟ پتے بھی نہیں ہیں۔ تنا کیسا ہے؟ تنا بھی اس کا نہیں ہے۔ جڑیں کیسی ہیں؟ جڑیں بھی نہیں ہیں۔ تو کیا تیرے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کھجور کے درخت کی ذات اس کی صفات کے ساتھ ہے۔ اس کا پھل ہے، اس کے پتے ہیں، تنا ہے، جڑیں ہیں۔ یہ اس درخت کی صفات ہیں۔ اگر صفات موجود نہیں بلکہ معدوم ہیں تو ذات کیسے بنے گی؟ وہ کہتے ہیں: صفات کو اگر مان لیں تو تشبیہ لازم آئے گی۔ تو یہ تشبیہ کا عذر تو ذات میں بھی ہے۔ نہیں، ذات کو ہم بغیر تشبیہ کے مانتے ہیں۔ بھئی، اگر تم نے ذات کو بغیر تشبیہ کے مانا تو ایسے ہی صفات کو بھی بغیر تشبیہ کے مان لو۔ سارے عذر ختم ہو جائیں گے۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [1] اس کی ذات، صفات اور اس کے افعال، یہ سارے کے سارے تمثیل اور تشبیہ سے پاک ہیں۔ تو بات بالکل واضح ہے۔ یہ ایک الحاد کی شکل ہے۔ انھوں نے تنزیہ کا راستہ اختیار کیا، اثبات کا انھوں نے انکار کیا اور اللہ کی تنزیہ کرنا چاہی لیکن تنزیہ کرتے کرتے وہ تعطیل کر بیٹھے اور اللہ کی ساری صفات اور سارے افعال کا انکار کر دیا۔

دوسرا گمراہ فرقہ معتزلہ کا ہے۔ انھوں نے جہمیہ کی طرح یہی عقیدہ اختیار کیا۔ ذات کو مانا اور ایک قدم آگے بڑھے، صفات کے الفاظ کو مان لیا، لیکن الفاظ کے معانی کو

[1] الشوریٰ 11:42.

نہیں مانا۔ الفاظ اس لیے مان لیے کہ کتاب و سنت میں موجود ہیں۔ سمیع ہونا، بصیر ہونا، رحمٰن ہونا، رحیم ہونا، حی و قیوم ہونا، یہ کتاب و سنت میں موجود ہے۔ الفاظ پر ایمان ہے لیکن کسی لفظ کا معنی معلوم نہیں ہے۔ کسی لفظ کا معنی نہیں ہے۔ ہر اسم بغیر صفت کے لیا، یہ بھی تعطیل ہے۔ جب معنی معلوم نہیں ہے تو صفات کو ذکر کرنے کا معنی کیا؟ اور صفات کے ساتھ ہمارا تعلق کیا بنے گا؟ ایک عبادت کرنے والے کو معلوم ہی نہیں کہ جس پروردگار سے میں محبت کرتا ہوں، وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تو عبادت کیا کرے گا؟ ایک استغفار کرنے والے کو معلوم ہی نہیں کہ جس ذات کے سامنے میں گڑگڑا کر توبہ کر رہا ہوں وہ غفار ہے ہی نہیں، بخشنے والا ہے ہی نہیں تو توبہ کیا کرے گا؟ تو ان صفات کے معانی اگر معلوم نہیں ہیں تو ان صفات کے ذکر کا مقصد کیا ہے؟ انھوں نے راستہ تنزیہ کا لیا لیکن تنزیہ میں تعطیل ہے۔ ہم اہل الحدیث کا موقف یہ ہے کہ ہمارا اثبات بغیر تشبیہ کے ہے اور ہماری تنزیہ بلا تعطیل ہے۔ اثبات بلا تشبیہ اور تنزیہ بلا تعطیل یہ توحید اسماء و صفات میں اس عقیدے کے دو ستون ہیں۔

تیسرا ایک اور فرقہ ہے: اشاعرہ ماتریدیہ۔ ہمارے اکثر احناف بھائی اسی عقیدے کے حاملین ہیں، اشعری یا ماتریدی۔ انھوں نے انکار کا راستہ نہیں لیا بلکہ تاویل کا راستہ لیا۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء کو مانا، صفات کو مانا لیکن صفات میں سے اکثر صفات کا معنی وہ نہیں لیا جو ظاہر کتاب و سنت پر محمول ہوتا ہے بلکہ وہ معنی لیا جو ان کی اپنی مرضی، اپنے مذہب اور اپنے مذہب کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ اس کو وہ تاویل کا نام دیتے ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میں اشاعرہ اور ماتریدیہ کے معانی کو تاویل نہیں کہتا کہ تاویل کی کچھ اساس ہوتی ہے۔ میں اس تاویل کو تحریف کہتا ہوں، معنوی تحریف۔

تاویل کی کچھ اساس ہوتی ہے، کچھ بنیاد، کچھ قرینہ، یہ ساری تاویلیں بغیر قرینے کے ہیں۔ ساری تاویلیں کسی قرینے پر قائم نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر تاویلیں وہ ہیں جو خالق اور مالک کی توہین کے مترادف ہیں، بطور مثال صفت استوا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿ الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾[1] رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔ استویٰ علی العرش، اس کا معنی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ عرش پر چڑھ گیا۔ استواء کا ظاہری معنی کلام عرب میں ارتفاع اور علو ہے۔ اللہ کا عرش اوپر ہے اور اللہ عرش پر مستوی ہوگیا، معنی عرش پر چڑھ گیا۔ ارتفاع اور علو کی صفت ثابت ہوگئی۔ اب یہاں کچھ لوگوں پر کئی قیامتیں ٹوٹ پڑیں کہ اللہ تعالیٰ کی اگر صفتِ علو کو مان لیا، صفت ارتفاع کو مان لیا تو ایک چیز اس سے ثابت ہو جائے گی اور وہ ہے جہت کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جہت ہے۔ وہ ایک جہت کے اندر محصور ہے، لہٰذا اپنے اس قائم کردہ محذور (ڈرنے والی حد) کی بنا پر اس معنی کا انکار کر دیا۔ تو پھر استوا کا کیا کرو گے؟ کلام عرب میں استوا چڑھنے اور بلند ہونے کے معنی میں ہے۔ اس کا کیا کرو گے؟ اس کی تاویل کریں گے۔ یہاں استوا بمعنی استعلاء ہے، بمعنی غلبہ۔ استوا کا معنی استعلاء اور غلبہ اس کا معنی ظاہر ہے۔ اور یہ ایک بات نوٹ کر لو اسماء و صفات کے عقیدے میں کہ ہر صفت اور ہر اسم کا ظاہری معنی مراد ہوگا الا یہ کہ کوئی قرینہ آجائے۔ اور قرینہ بھی شرعی ہو جو اس معنی سے صارف ہو۔ پھر اس قرینے کو دیکھا جائے گا۔ لیکن ہر نام، ہر صفت ظاہر معنی کے ساتھ ہے اور استوا کا معنی استعلاء اور غلبہ، یہ ظاہر معنی نہیں ہے۔ یہ تاویل ہے اور تاویل بھی نہیں بلکہ تحریف ہے۔ رحمٰن عرش پر غالب آگیا۔ کلام عرب میں یہ معنی کہیں موجود نہیں۔ ایک مجہول شاعر کے ایک شعر کو

[1] طٰہٰ 20:5.

دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا جو قطعاً حجت نہیں۔اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کی توہین پر منتج ہوتا ہے۔ اللہ عرش پر غالب آ گیا۔ یہاں دو اشکال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب کوئی نہیں دے سکا۔ ایک اشکال یہ کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہے۔کیا اللہ تعالیٰ عرش کے علاوہ کسی چیز پر غالب نہیں ہے۔ اگر کہو غالب ہے تو عرش کی تخصیص کا معنی کیا ہوا؟ اللہ نے اپنے غلبے کو عرش کے ساتھ مقید کیوں کر دیا؟ پھر سب سے اوپر اللہ کی مخلوق عرش ہے اور سب سے نیچے اللہ کی مخلوق ساتویں زمین ہے۔کیا اللہ تعالیٰ صرف عرش پر غالب ہے اور ساتویں زمین پر غالب نہیں ہے؟ اس کا جواب اگر ہاں میں دیتے ہو کہ اللہ ساتویں زمین پر غالب ہے تو پھر عرش کی تخصیص کا معنی کیا ہوگا؟ اور اگر نفی میں دیتے ہو تو اللہ رب العزت کے غلبے کا انکار کفر ہے۔کوئی اس کا جواب نہیں دے سکا۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ فلاں غالب آ گیا۔ یہ جملہ کب کہا جاتا ہے؟ جب ایک چیز کو حاصل کرنے کے لیے بہت سے لوگ کوشش کریں۔ چیز ایک ہے اور اس کے دعوے دار بہت ہیں اور سب کوشش کر رہے ہیں، لڑ رہے ہیں، جھگڑ رہے ہیں۔ جھگڑا ہوتے ہوئے ایک سب پر غالب آ جائے اور باقی سب مغلوب ہو جائیں تو کہا جاتا ہے کہ فلاں غالب آ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے عرش پر غلبے کا کون خواہش مند تھا؟ نعوذ باللہ، کوئی اللہ تعالیٰ کا مقابل تھا؟ کوئی مخالف تھا، کوئی حریف تھا اللہ تعالیٰ کا؟ کہ اس عرش کو حاصل کرنے میں جھگڑا کر رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا معارض اور مخالف ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مات دے کر غلبہ حاصل کر لیا، بالکل نہیں۔ اور فلاں غالب آ گیا۔ یہ جملہ تبھی کہا جاتا ہے جب اس چیز کے حصول میں کئی لوگ کوشاں ہوں۔ اور یہ دونوں باتیں اللہ رب العزت کی توہین ہیں۔تو ایک ایسی تاویل جو پروردگار کی توہین پر منتج ہو، وہ تاویل نہیں ہے، وہ تحریفِ معنوی ہے۔

ہم اہل الحدیث کا عقیدہ ان تاویلات سے پاک ہے۔ اور یہ بات یاد رکھو! اگر جہمیہ اور معتزلہ نے اللہ کی صفات کا انکار کیا تو تاویل کا یہ راستہ بھی انکار ہی ہے۔ ان لوگوں نے بظاہر مانا ضرور لیکن جو معنی ان صفات کا کیا چونکہ وہ معنی بنتا ہی نہیں، پھر وہ انکار ہی ہوگا۔ مانا کب قابل قبول ہوگا؟ جب بالکل اللہ تعالیٰ کی منشا اور مراد کے مطابق مانا جائے۔ امام شافعی ؒ کا قول ہے: «نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَاجَاءَ مِنَ اللّٰهِ عَلٰى مُرَادِ اللّٰهِ وَ نُؤْمِنُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ وَمَاجَاءَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ عَلٰى مُرَادِ رَسُوْلِ اللّٰهِ» ہمارا اللہ پر ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ آیا، جو پیغام پہنچا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی مراد کے مطابق ایمان ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر بھی ایمان ہے اور پیغمبر علیہ السلام کی طرف سے جو کچھ آیا، اس پر بھی ایمان ہے رسول اللہ ﷺ کی مراد کے مطابق۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ عیسائی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں، ماننا چاہیے وہ اللہ کے رسول ہیں۔مگر وہ اپنی مراد کے مطابق مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نعوذ باللہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو مانا ضرور مگر مراد اللہ کی نہیں، اپنی مراد کے مطابق۔ تو یہ ماننا معتبر ہوگا؟ قابل قبول ہوگا؟ نہیں۔ ان کا یہ ماننا قابل قبول نہیں ہے۔ عزیر علیہ السلام کو یہودی مانتے ہیں۔ کس طرح؟ اپنی مراد کے مطابق۔ وہ کہتے ہیں: عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ عزیر علیہ السلام کو ضرور انھوں نے مانا مگر مراد اللہ کی نہیں، مراد اپنی ہے۔ تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ یہودی عزیر کو مانتے ہیں۔ جس عزیر کو وہ اللہ کا بیٹا قرار دے کر مانتے ہیں، وہ اللہ کا بیٹا ہے ہی نہیں۔ تو ان کا یہ ایمان کیسے قابل قبول ہوگا۔ میرے سامنے یہ مائیک ہے لوہے کا۔ میں کہوں: میں اس کو مانتا ہوں لیکن لکڑی کا ہے۔ لکڑی کا تو ہے ہی نہیں۔ تو میں نے اس مائیک کو مانا؟ نہیں۔ جو اس کی صفت میں نے خود قائم کر لی

وہ صفت اس کے اندر ہے ہی نہیں۔ تو پھر اشاعرہ اور ماتریدیہ کا جو موقف ہے جس کو وہ ماننا کہتے ہیں بصورت تاویل، چونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی مراد کے خلاف ہے، لہٰذا وہ ماننا معتبر نہیں ہے، یہ قابل قبول نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے: ہم اہل الحدیث کا عقیدہ اللہ رب العزت کے اسماء و صفات کے بارے میں دوستونوں پر قائم ہے: «إِثْبَاتٌ بِلَا تَشْبِيهٍ وَّ تَنْزِيهٌ بِلَا تَعْطِيلٍ» اللہ رب العزت کی تمام صفات کمال جو کتاب و سنت میں ثابت ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے اور وہ بلاتشبیہ ہیں۔ کسی صفت میں خالق اپنی مخلوق کے مشابہ نہیں ہے۔ اور نہ کوئی مخلوق خالق کے مشابہ ہے۔ ہاں، اگر لفظی اشتراک ہے تو لفظی اشتراک صرف ہمارے فہم کے لیے ہے تاکہ ہم سمجھ جائیں۔ وہاں یہ کہا جائے گا کہ یہ لفظ اللہ کے لیے بھی ثابت ہے ہمارے لیے بھی۔ اللہ کے لیے کیسے؟ جیسے اللہ کے لائق ہے۔ ہمارے لیے کیسے؟ جیسے ہمارے لائق ہے۔ جیسے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ [1] اللہ سمیع اور بصیر ہے۔ انسانوں کے بارے میں بھی ہے: ﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ [2] کہ ہم نے انسانوں کو بھی سمیع اور بصیر بنایا۔ یہ لفظی اشتراک ہے۔ سمیع کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ہے اور بندوں کے لیے بھی۔ اللہ سمیع ہے، سنتا ہے، کیسے؟ جیسے اس کے لائق ہے۔ کیا اس کا سننا ہمارے جیسا ہے؟ نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [3] اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ ہمارا صفت سمع پر ایمان ہے۔ جیسا اس کے لائق ہے ویسا وہ سنتا ہے۔ اور اس کا سننا ایسا ہے کہ پہاڑ کی تہ میں کوئی چیونٹی چل رہی ہو، اللہ تعالیٰ اس چیونٹی کے چلنے کی آواز کو عرش معلی پر سنتا ہے۔ کیا ہمارا سننا ایسا ہے؟ یہ

[1] النسآء 4:134. [2] الدھر 76:2. [3] الشوریٰ 42:11.

صرف لفظی اشتراک ہے ہمیں سمجھانے کے لیے تاکہ صفت سمع کو ہم سمجھ سکیں۔ باقی اللہ کا سننا جیسا اللہ کے لائق ہے۔ اور صفات باری تعالیٰ کے بارے میں ہمارا عقیدہ توقیف پر قائم ہے۔ جو خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے گی اس پر ایمان لاتے جاؤ۔ اور جو خبر اللہ کی طرف سے نہیں اس پر خاموش رہو۔ آگے صفت بصیر، اللہ دیکھتا بھی ہے۔ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔ لیکن سمع اور بصر میں ایک فرق ہے۔ بصیر کے بارے میں وضاحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں سے دیکھتا ہے لیکن سمیع کے بارے میں صراحت موجود نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کانوں سے سنتا ہے، یہ موجود نہیں ہے۔ اب یہ سارا مسئلہ توقیف پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس کا دیکھنا کیسا ہے؟ ہمیں معلوم نہیں۔ اس کی آنکھیں کیسی ہیں؟ ہمیں معلوم نہیں۔ جیسے اس کے لائق ہے ویسی ہیں۔ کیونکہ اس کی ہر صفت، صفت کمال ہے۔ کیا ہم جیسی ہیں؟ ہم جیسی نہیں ہیں کیونکہ وہ ذات تشبیہ سے پاک ہے۔ صفت سمع کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ کتاب و سنت میں کہیں موجود نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح سنتا ہے، اس کے کانوں کا ذکر نہیں ہے۔ اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کانوں سے سنتا ہے، نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بغیر کانوں کے سنتا ہے۔ کیونکہ نہ کانوں کا اثبات ہے نہ ان کی نفی ہے۔ جو چیز ثابت ہے، اس کو مان لو اور جو چیز ثابت نہیں ہے، اس پر خاموش رہو۔ بصر میں عین (آنکھیں) ثابت ہے، اس کو مان لو اور سمع میں اذن (کان) ثابت نہیں ہے، اس پر خاموشی اختیار کرلو۔ اللہ تعالیٰ سنتا ہے۔ اس کا سننا کمال ہے، اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ ہر صفت پر یہی قاعدہ لاگو ہوگا: «إِثْبَاتٌ بِلَا تَشْبِيهٍ وَّ تَنْزِيهٌ بِلَا تَعْطِيلٍ» دوسرے یہ کہ وہ صفاتِ نقص سے پاک ہے اور اس کا پاک ہونا تعطیل کے بغیر ہے۔ ہم جہمیہ

اور معتزلہ کی طرح اس طرح اس کی پاکی بیان نہیں کرتے کہ اس کی صفاتِ ثابتہ کا بھی انکار کر دیں۔ نہیں، ہمارے اثبات میں یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ اس کا اثبات تشبیہ سے پاک ہے اور تنزیہ میں یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ اس کی تنزیہ تعطیل سے پاک ہے۔

میرے دوستو اور بھائیو! ان دو بنیادوں کے ساتھ اسماء و صفات کی توحید کو سمجھو۔ آج جو علم مفقود ہوتا جارہا ہے، اتنی اس کی قدر نہیں، اتنی اس کی معرفت نہیں۔ ہم نے قدرے تفصیل سے کچھ قواعد آپ کے سامنے رکھے ہیں تاکہ اس علم سے آپ کا تعلق ہو۔ اس تعلق کا فائدہ کیا ہے؟ فوائد میں بڑی طویل گفتگو ہوسکتی ہے لیکن وقت نہیں۔ صرف ایک مثال آپ کو دیتا ہوں کہ توحید اسماء و صفات کی صحیح معرفت کس قدر مفید، باعث برکت اور رحمت ہے اور کس قدر اجر کا باعث ہے۔ قرآن پاک کی چھوٹی سی سورت ہے، سورۂ اخلاص۔ اس کو سورۂ توحید بھی کہتے ہیں۔ یہ اللہ کی توحید کی سورت ہے۔ اس کے بڑے فضائل ہیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث صحیح بخاری میں ہے۔ ایک شخص اپنے پڑوسی کی شکایت لے کر حاضر ہوا کہ رات میرے پڑوسی قتادہ بن نعمان نے تہجد پڑھی اور ان کی قراءت کی آواز میرے گھر میں آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ تہجد میں ان کا قیام بڑا لمبا ہوتا تھا اور پورے قیام میں سورۂ فاتحہ کے بعد صرف ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھتے رہے۔ اور کچھ نہیں پڑھا۔ حالانکہ حافظ قرآن ہیں لیکن پوری تہجد کی نماز کے ہر قیام میں بار بار سورۂ اخلاص پڑھ رہے ہیں۔ وہ شخص ان کے اس عمل کو چھوٹا سمجھ رہا تھا۔ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ سورۂ اخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ [1] یہ چھوٹی سی سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔

[1] صحيح البخاري، حديث:7374.

کے برابر ہے۔ دوسری حدیث، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور میں ایک سریہ (چھوٹا فوجی دستہ) بھیجا، ایک صحابی کو اس کا امیر بنادیا۔ وہ صحابی اس مشن سے کامیاب لوٹا، لشکر واپس لوٹ آیا تو پیغمبر علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے اس امیر کی رپورٹ مانگی کہ وہ کیسا امیر تھا، کس طرح قیادت کی۔ صحابی نے کہا کہ بہترین امیر، حتی کہ مشن کامیاب ہوگیا، مگر ایک چیز ہم نے نئی دیکھی کہ دورانِ سفر اس نے جب بھی جماعت کرائی تو نماز کی ہر رکعت میں قراءت کا اختتام سورۂ اخلاص سے کیا۔ یہ ہم نے ایک نئی چیز دیکھی۔ فرمایا: پوچھو اس نے ایسا کیوں کیا؟ پوچھا گیا۔ اس نے کہا: «لِأَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ» اس لیے کہ یہ سورت اللہ رب العزت کی صفات پر مشتمل ہے اس لیے مجھے اس کا پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ یہ محبت کی وجہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کے جملے منقول ہیں۔ ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ «أَنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهُ» [1] اس نے اس سورت سے محبت کی، اسے بتا دو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن چکا ہے۔ دوسرا جملہ یہ منقول ہے: «حُبُّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ» کہ اس سورت کی محبت نے تمھیں جنت میں داخل کردیا ہے۔ [2] اس کی فضیلت میں احادیث بے شمار ہیں۔ تبھی تو پیغمبر علیہ السلام اکثر پڑھا کرتے تھے، ہر نماز کے بعد پڑھا کرتے۔ مغرب کے بعد تین بار پڑھتے۔ فجر کے بعد تین بار پڑھتے۔ صبح و شام کے اذکار میں اس سورت کی تلاوت کرتے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے یہ نکتہ بیان کیا کہ پیغمبر علیہ السلام اپنے دن کا آغاز بھی سورۂ اخلاص سے کرتے اور دن کے کاموں کا اختتام بھی سورۂ اخلاص سے کرتے۔ چنانچہ فجر کی دو سنتوں میں پیغمبر علیہ السلام دوسری رکعت میں سورۂ اخلاص پڑھا

[1] صحيح البخاري، حديث:7375. [2] صحيح البخاري، حديث:774م.

کرتے [1] اور فجر کی سنتیں یہ دن کا آغاز ہیں۔ اور وتر رات کی آخری نماز ہے۔ اور وتر کی تیسری رکعت میں پیغمبر علیہ السلام سورۂ اخلاص پڑھا کرتے تھے، [2] یعنی دن کا آغاز بھی سورۂ اخلاص کے ساتھ اور دن کا اختتام بھی سورۂ اخلاص کے ساتھ۔ اب سوال یہ ہے کہ اتنی فضیلت کیوں؟ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کلام الرحمٰن ہے۔ یہ بات معلوم ہے۔ ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ بھی کلام الرحمٰن ہے۔ یہ بات معلوم ہے۔ یہ چھوٹی سی سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ [3] سورۂ بقرہ ڈھائی پاروں کی سورت ایک تہائی قرآن کے برابر نہیں ہے۔ وہ بھی اللہ کا کلام ہے، یہ بھی اللہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کی جو عمومی فضیلت ہے وہ حدیث میں موجود ہے کہ ایک حرف کی دس نیکیاں ملتی ہیں، لیکن سورۂ اخلاص کو یہ فضیلت کیوں حاصل ہے؟ کلام الرحمٰن وہ بھی ہے اور یہ بھی ہے۔ اس لحاظ سے دونوں کی فضیلت برابر ہے۔ ہر حرف کی دس نیکیاں۔ لیکن کچھ کلام ایسے ہیں جس کا مضمون دوسرے کلام سے اعلیٰ اور افضل ہے، چنانچہ سورۂ اخلاص کا مضمون جو ہے وہ ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ﴾ سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ سورۂ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر ہے۔

اور خاص طور پر جو میں سمجھا ہوں واللہ اعلم، اس سورت کی فضیلت کہ یہ ایک سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے، اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات ایسی ہیں جو پورے قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہیں۔ ایک احد اور دوسری صمد۔ احد اور صمد، یہ دو صفات پورے قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے سورۂ اخلاص کے اس اجر کی اساس یہی ہو۔ وجہ کیا ہے؟ اس لیے کہ احد اور صمد یہ دو وہ خوبیاں اور صفات ہیں جن

[1] صحيح مسلم، حديث: 726. [2] سنن النسائي، حديث: 1732. [3] صحيح البخاري، حديث: 5013، و صحيح مسلم، حديث: 811.

کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر ہوتا ہے۔ ان دو صفات کا اجراء اللہ تعالیٰ کی تمام صفت پر ہوتا ہے۔ احد کا معنی اللہ ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ ایک ہے۔ اس کو ایک ماننا، یہ سب سے اہم اللہ رب العزت کی صفت ہے کہ وہ ایک ہے۔ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو حسن ادب ہے وہ اس کی وحدانیت میں ہے، اس کے ایک ہونے میں ہے۔ لہٰذا اس ادب میں جملے بھی ہمیں ایسے استعمال کرنے چاہئیں جن میں توحید کی خوشبو ہو، مثلاً: بعض لوگ کہتے ہیں: اللہ فرماتے ہیں۔ اللہ یوں کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ ادب ہے۔ یہ ادب نہیں ہے۔ اللہ کا ادب جمع کے صیغے میں نہیں ہے۔ کیونکہ جمع کا صیغہ تعدد کا وہم پیدا کرتا ہے۔ اس کا ادب واحد کے صیغے میں ہے، اللہ فرماتا ہے۔ اللہ یوں کرتا ہے۔ اللہ نزول فرماتا ہے۔ واحد کے صیغے میں۔ کیونکہ جمع کے صیغے میں تعدد کی آمیزش ہے اور واحد کا صیغہ توحید میں صریح ہے۔ تو ایسا صیغہ اللہ کا ادب ہے جو توحید میں صریح ہو۔ تو احد اللہ تعالیٰ کی وہ صفت ہے جس کا اطلاق ساری صفات پر ہوتا ہے، مثلاً: صفت الرحیم، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو سمجھنے کا طریقہ اور اس کی صفات پر ایمان لانے کا ادب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رحیم، صفت رحمت، اس کو ہم احد کے ساتھ کیسے مانیں؟ کہ اللہ رحمان ہے اور رحمٰن ہونے میں احد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اللہ رحیم ہے اور رحیم ہونے میں احد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اللہ سمیع ہے اور سمیع ہونے میں احد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اللہ بصیر ہے اور بصیر ہونے میں احد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح تمام صفات پر صفت احد کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور یہ صفات کو ماننے کا طریقہ ہے۔ اور صفات پر ایمان لانے کا ادب ہے۔ صمد بھی اسی طرح ہے۔ صمد کے

کئی معانی ہیں۔ ایک معنی جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمال میں کامل ہے۔ [1] کوئی نقص نہیں ہے۔ اور یہ صفت بھی ساری صفات پر قائم ہے۔ اللہ رحمٰن ہے اور رحمٰن ہونے میں کامل ہے۔ کیونکہ وہ صمد ہے۔ اللہ رحیم ہے اور رحیم ہونے میں کامل ہے، کوئی نقص نہیں ہے کیونکہ وہ صمد ہے۔ «اَلسَّيِّدُ الَّذِي قَدْ كَمُلَ فِي سُؤْدَدِهِ، وَالشَّرِيفُ الَّذِي قَدْ كَمُلَ فِي شَرَفِهِ، وَالْعَظِيمُ الَّذِي قَدْ كَمُلَ فِي عَظَمَتِهِ، وَالْحَلِيمُ الَّذِي قَدْ كَمُلَ فِي حِلْمِهِ، وَالْعَلِيمُ الَّذِي قَدْ كَمُلَ فِي عِلْمِهِ، وَالْحَكِيمُ الَّذِي قَدْ كَمُلَ فِي حِكْمَتِهِ» یعنی اس صفت کا ساری صفات پر اجراء۔ اللہ حیّ ہے اور حیّ ہونے میں کامل ہے، کوئی نقص نہیں ہے۔ اللہ قیوم ہے، قیوم ہونے میں کامل ہے اور کوئی نقص نہیں ہے۔ یہ صفت صمد ہے۔ تو اس سورت میں واللہ اعلم، یہ بات سمجھ میں آرہی ہے، اتنی فضیلت کیوں ہے؟ اس کو یہ خصوصیت کیوں حاصل ہے؟ ایک لائن کی سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق صفات الرحمٰن سے ہے اور اس سورت میں دو صفات ایسی ہیں جو کہیں مذکور نہیں اور وہ اتنی جامع ہیں کہ تمام صفات پر ان دو صفات کا اجرا اور اطلاق ہوتا ہے۔ اب ایک شخص سورۂ اخلاص پڑھتا ہے اور اسے ان معنوی گہرائیوں کا علم نہیں ہے، اس کا یہ پڑھنا اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہے یا نہیں ہے، ہم کچھ نہیں کہتے۔ لیکن ایک شخص سورت پڑھتا ہے اور اسے احد اور صمد ان دونوں صفات کی معنوی گہرائیوں کا علم ہے کہ احد کیا ہے؟ صمد کیا ہے؟ یہ دو صفات کتنی جامع ہیں اور کس طرح ساری صفات ان دو صفات پر قائم ہیں جب یہ سب کچھ سوچ کر اور علم کے ساتھ، یقین

[1] تفسیر ابن کثیر، الإخلاص 2:112.

اور معرفت کے ساتھ اس سورت کو پڑھے گا تو کس قدر وہ اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی رحمت اور اس کے فضل کو حاصل کرلے گا۔

اور میں آپ کو بتادوں کہ توحید معرفت عبادات پر بھاری ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بیسیوں سال کی عبادت سے توحید معرفت بڑھ جائے۔ توحید معرفت کیا ہے؟ اللہ کی پہچان۔ اللہ کو پہچانو! اللہ تعالیٰ اپنے آپ کی پہچان کرانا چاہتا ہے۔ ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ [1] ﴿لِتَعْلَمُوْۤا﴾ تاکہ تم کو علم حاصل ہو، تم جان لو۔ اللہ فرمارہا ہے کہ ہم نے سات آسمان بنائے، زمینیں بھی اتنی ہیں۔ آسمانوں اور زمینوں کے مابین اللہ کا امر نازل ہوتا ہے، اس کا حکم اترتا ہے۔ ہم اپنی صفات کا تعارف کیوں کرارہے ہیں؟ اپنا خالق ہونا اور مدبر ہونا، یہ تعارف کیوں پیش کررہے ہیں؟ تاکہ تم کو علم ہوجائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ازروئے علم کے پوری کائنات کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ یہ معرفت ہے۔ بعض اوقات یہ معرفت سیکڑوں سال کی عبادت پر بھاری پڑسکتی ہے۔ تو یہ معرفت کیسے حاصل ہوگی؟ اللہ رب العزت کے اسماء اور صفات کی توحید کے بغیر کیا یہ معرفت حاصل ہوسکتی ہے؟ اور معرفت اگر صحیح حاصل ہو تو یہ اللہ کا فضل وکرم ہے۔ ورنہ ایک معاشرہ اللہ رب العزت کے تعلق سے صحیح علم پر قائم نہیں ہے۔ جہاں یہ لوگ خالق کو مخلوق کے مشابہ قرار دیں، جہاں پر لوگ کتاب وسنت میں خالق کی بیان شدہ صفات کا انکار کردیں اور بقول عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے جہمیہ اور معتزلہ کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جو

[1] الطلاق 12:65.

کتاب وسنت نے بیان کیں، ان کی نفی کر دیں، ان کا انکار کر دیں اور اپنی مرضی کا خدا کھڑا کر دیں۔ یہ ان کا مقصد ہے۔ جو اللہ کی صفات قرآن اور حدیث میں ہیں ان کا انکار کر کے اپنی مرضی کا الٰہ کھڑا کر دیں، یہ ان کا مقصد ہے۔ تو جہاں کچھ لوگ، جو بہت تھوڑے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی صحیح معرفت حاصل کرتے ہیں، اس کے لیے کوشش کرتے ہیں، ان کا علم اس معرفت پر قائم ہے تو کتنے برگزیدہ لوگ ہیں۔ عبادت سے زیادہ اس معرفت کا اجر ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، بقیہ صحابہ عبادت میں برابر تھے۔ نبی علیہ السلام کے پیچھے سب نماز پڑھتے تھے۔ رات کو سب تہجد پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، عمل میں برابر ہیں لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق کیوں بن گئے؟ اس امت کے سب سے افضل کیوں بن گئے؟ عبادت میں ہوسکتا ہے کئی صحابی ان سے زیادہ ہوں لیکن، اصل چیز معرفت ہے۔ اس علم اور معرفت میں ان کا کوئی مقابل اور ثانی نہیں ہے۔ تو اس لیے میں نے وضاحت سے کچھ یہ تفصیل عرض کر دی کہ اللہ رب العزت کی صفات کو پڑھو، سمجھو اور توحید کے علم کو حاصل کرو۔ یہ اسماء اور صفات توحید کی بنیاد ہیں، اور کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ میں اہل الحدیث ہونے کے ناتے توحید میں کامل ہوں، نہیں۔ بحمد اللہ توحید کا فہم اساسی طور پر حاصل ہے لیکن ان گہرائیوں کے ساتھ اللہ رب العزت کی توحید کو پہچانو اور پڑھو۔ اس کا علم حاصل کرو۔ یہ معرفت بڑی برگزیدہ ہے۔ اور یہ علم اللہ کے قرب کا باعث بنے گا۔ ہر علم اپنے معلوم کے ساتھ معتبر ہے۔ کوئی علم افضل ہے، کوئی اعلیٰ، کوئی گھٹیا۔ اور ہر علم کی شان اس کے معلوم کے ساتھ ہے۔ ایک شخص کا علم جوتے جوڑنا تو اس کے علم کا معلوم جوتا ہے۔ ایک شخص ہے اس کا علم ایٹم بم ہے تو اس کے علم کا معلوم ایٹم بم ہے۔ اور یہ جو علم ہے اسماء وصفات کا، اس علم کا معلوم اللہ رب العزت ہے۔ تو

کوئی علم اس کا مقابلہ کرسکتا ہے؟ اس لیے اس علم کو حاصل کرو، اس علم کے معلوم کو پہچانو۔ اور یہ ہم درویشوں کی دعوت ہے، اللہ تک رسائی۔ لوگ تو آج ہمارا مذاق اڑاتے ہیں کہ چٹائیوں پر بیٹھنے والوں نے بس ایک ہی رٹ لگائی ہوئی ہے حلال وحرام اور توحید اور توحید۔ ہاں لوگ مذاق کرتے ہیں۔ دنیا چاند پر پہنچ گئی اور مریخ تک رسائی حاصل کرنے کے پروگرام ہیں، چاند پر جھنڈے گاڑ چکے ہیں اور مریخ تک گاڑنے جارہے ہیں اور یہ لوگ ابھی تک توحید اور حلال وحرام، استنجا اور وضو کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جو لوگ یہ باتیں کرتے ہیں وہ ذہنی طور پر پسماندہ اور قلاش ہیں۔ ایسے لوگوں پر رحم اور ترس کھانا چاہیے۔ جو چاند پر جانا چاہتے ہیں اور جا چکے ہیں اور مریخ تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں، تحقیقات ہو رہی ہیں۔ اس کو ترقی کہا جارہا ہے۔ ہاں! ہم درویشوں کے نزدیک یہ سارے کام فضول اور عبث ہیں۔ ٹھیک ہے چاند بہت اوپر ہے، مریخ اس سے اوپر ہے لیکن سب سے اوپر ہمارا پروردگار ہے۔ ہمارے علم کی رسائی چاند تک نہیں ہے، مریخ تک نہیں ہے، یہ علم کوتاہ ہے۔ ہمارے علم کی رسائی ہمارے پروردگار تک ہے۔ کوئی ہے اس کا مقابل؟ کھڑا کرے کوئی اس کا مقابل۔ یہاں مذاق کرنے والے، تمھارا علم یہاں دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ صور پھونکا جائے گا سارے کمپیوٹر، ساری ترقیاں، یہ ساری رصدگاہیں مٹی کا ڈھیر بن جائیں گی اور ایک ہی چیز باقی رہ جائے گی: ﴿ وَقِفُوهُمْ ۖ إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ ۝ ﴾ [1] اللہ پکارے گا: سب کو روک لو، میں نے سب سے سوال کرنے ہیں۔ پھر وہ سوال چاند کے بارے میں نہیں ہوگا، مریخ کے بارے میں نہیں ہوگا، کمپیوٹر کے بارے میں نہیں ہوگا، وہ سوال پروردگار کی توحید

[1] الصّٰفّٰت 37:24.

کے بارے میں ہوگا اور اللہ کے پیغمبر ﷺ کی سنت کے اتباع کے بارے میں ہوگا۔ پھر بتاؤ! ترس کھائے جانے کے قابل کون ہے؟ تمھارے علم کا معلوم کیا ہے؟ اور ہمارے علم کا معلوم کیا ہے؟ ہمارے علم کا معلوم ہمارا پروردگار ہے۔ اس کے اسماء ہیں، اس کی صفات ہیں۔ اور تمھارے علم کا معلوم ایک ایسا معلوم ہے جو دنیا تک محدود ہے۔ اس کی منفعتیں ہیں یا نہیں، ہم نہیں جانتے، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ساری کوششیں عبث ہیں، بے کار ہیں۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ ان چٹائیوں پر آؤ، اس علم کو حاصل کرو، اس علم کی بڑی شان اور بڑے اونچے درجات ہیں۔

یہاں دوسرا موضوع جو ہے اس آخری کتاب میں وہ امام بخاری رحمہ اللہ کا باب ہے۔ جو قرآن کی ایک آیت پر قائم ہے: باب قوله تعالىٰ: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَٰزِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَٰمَةِ﴾ [1] اللہ فرماتا ہے کہ ہم قیامت کے حساب کے لیے عدل کے ترازو قائم کریں گے، اللہ اکبر۔ اس کو ذرا آنکھیں بند کر کے سوچو کہ پروردگار کے سامنے پیش ہونا ہے، اللہ تعالیٰ پہلے ہم سے باتیں کرے گا اور ہماری زندگی اور خاص طور پر جوانی کے ایک ایک لمحے کا سوال کرے گا۔ پوچھ گچھ ہوگی۔ پھر حساب یہیں پر ختم نہیں ہوگا۔ سوالات کے بعد اللہ تعالیٰ آگے بڑھا دے گا کہ ہم نے تمھارے اعمال تولنے کے لیے عدل کا میزان قائم کیا ہے۔ حساب کتاب کے دو مرحلے ہیں: ایک ہے اعمال کی گنتی جو اللہ تعالیٰ نے پوری طرح عدل کی حجت قائم کرنی ہے۔ ﴿مَٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ [2] یوم جزا کا مالک ہے، اس نے جزا اور سزا میں عدل قائم کرنا ہے، انصاف نہیں عدل۔ انصاف اور عدل میں فرق ہے۔ انصاف نِصفٌ سے ماخوذ ہے۔ نِصفٌ کا معنی آدھا

[1] الأنبياء 21:47. [2] الفاتحة 1:4.

ہے۔ انصاف کا معنی یہ ہوتا ہے کہ دو شخص ایک چیز کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک روٹی کے بارے میں۔ ایک کہہ رہا ہے روٹی میری ہے۔ دوسرا کہتا ہے: میری ہے۔ فیصلہ کسی شخص کے پاس چلا جائے کہ یہ روٹی ہے اس کا فیصلہ کر دو؟ وہ کہے کہ تم اختلاف نہ کرو آدھی تمھاری، آدھی تمھاری۔ یہ انصاف ہے۔ آدھا آدھا دے دینا اور دونوں کو خوش کر دینا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انصاف نہیں کرے گا کہ آدھا آدھا دے کر راضی کر دے۔ اسے ایک ایک نیکی کا اور ایک ایک گناہ کا علم ہے۔ اس نے عدل قائم کرنا ہے۔ عدل کے دو مرحلے ہیں: ایک اعمال کی گنتی، دوسرا اعمال کا وزن۔ گنتی کی صورتیں بہت سی ہیں، مثلاً: ایک صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے صحیفے کھول دے گا۔ فرشتوں نے تمھارے صحیفے تیار کر رکھے ہیں، تمھاری ایک ایک بات، ایک ایک عمل یہاں درج ہے۔ وہ صحیفے کھل جائیں گے۔ اعمال کی گنتی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ زبانوں پر مہر لگا دے گا۔ بندے کے اعضاء بولیں گے۔ آنکھیں بول رہی ہیں، کان بول رہے ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں بول رہے ہیں۔ یہ سب اعمال کی گواہی دیں گے۔ یہ بھی اعمال کی گنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ زمین سے کہے گا: تو بول، سارے راز اگل دے، تو بندے کی راز دان ہے، بندے نے ساری زندگی تجھ پر گزاری ہے۔ ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ [1] زمین اپنی خبریں بیان کر دے گی۔ اعمال سامنے آ رہے ہیں۔ ﴿وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ﴾ [2] ہر شخص آئے گا اور اس پر دو فرشتے مامور ہوں گے: ایک سائق اور ایک شہید۔ سائق کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ اس کو ہانکتا ہوا اللہ کے سامنے کھڑا کر دے گا اور شہید کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب وہ ہانکا جا رہا ہوگا تو اس کے

[1] الزلزال 99:4. [2] قٓ 50:21.

اعمال کی گواہی دیتا ہوا آئے گا کہ یہ شخص جو پیش ہونے جارہا ہے اس کے اعمال ایسے، اس کی کرتوتیں ایسی اور اس کا کردار ایسا تھا۔ گواہی دیتا ہوا آئے گا۔ یہ سارے کام پہلے مرحلے سے متعلق ہیں، یعنی اعمال کی گنتی۔ اب بندہ اللہ کے سامنے کھڑا ہوگا۔ نبی علیہ السلام کی حدیث ہے: «لَاتَزُولُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ» کسی بندے کے قدم اللہ تعالیٰ کی عدالت سے ایک بال کے برابر بھی نہ ہل سکیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کے پانچ سوالوں کے جواب نہ دے دے۔ ایک پوری زندگی کے بارے میں کہاں گزاری، دوسرا جوانی کے بارے میں کہ جوانی کہاں بوسیدہ کی اور تیسرا مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا۔ اور چوتھا بھی مال کے بارے میں کہ کہاں خرچ کیا۔ اور پانچواں علم کے بارے میں، اس علم کے برابر اپنا عمل پیش کرو۔ [1] یہ اعمال کی گنتی ہے۔ ان سب سے فارغ ہونے کے بعد یہ فرمان قائم ہے: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ [2] ہم قیامت کے حساب کے لیے عدل کا میزان بھی قائم کریں گے۔ اب یہ حساب کی دوسری نوعیت ہے۔ پہلے اعمال کی گنتی ہو رہی ہے۔ نمازیں پوری ہیں یا نہیں، زکاۃ پوری ہے یا نہیں، حج ادا کیا یا نہیں، روزے پورے رکھے یا نہیں رکھے، گناہ کتنے کیے۔ یہ اعمال کی گنتی ہے۔ اب نیا مرحلہ ان اعمال کو تولا جارہا ہے۔ کیونکہ کسی بھی چیز کے بارے میں دو بنیادیں ہوتی ہیں: ایک اس کی مقدار، دوسرا اس کا معیار۔ اگر مقدار میں کمی ہو تو وہ قابل قبول نہیں ہوتی۔ مقدار اگر پوری ہو اور معیار میں کمی ہو تو وہ بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ بعض پٹرول پمپوں پر لکھا ہوتا ہے کہ معیار اور مقدار کی ضمانت کے ساتھ، یعنی کانٹا بھی پورا ہے اور معیار بھی درست ہے، اس

[1] جامع الترمذي، حديث:2416. [2] الأنبياء 47:21.

میں کوئی ملاوٹ نہیں۔ اگر پٹرول کا کانٹا غلط ہو، آپ وہاں سے پٹرول لینا گوارا نہیں کریں گے۔ اور اگر کانٹا درست ہو لیکن پٹرول میں ملاوٹ ہو تو آپ وہاں سے پٹرول لینا قبول نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اعمال کے تعلق سے ان دونوعیتوں کا حساب لے گا۔ پہلے مقدار کی کہ عمل کی مقدار پوری ہے یا نہیں۔ اس کے بعد عمل کا معیار چیک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ میزان قائم کردے گا۔ اس کے دو پلڑے ہیں اور ایک اس کی زبان، یعنی اس کا کانٹا جو وزن کو سیدھا کرے گا۔

تولنے کا معنی کیا ہے؟ تولنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمال کا معیار جاننا چاہتا ہے۔ کیونکہ دین اسلام میں صرف عمل کی گنتی کافی نہیں۔ بلکہ عمل کی قبولیت کے تعلق سے بہت سے معیار اور بہت سی کسوٹیاں ہیں جنھیں ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے، مثلاً: ایک کسوٹی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ عمل قبول کرے گا جو عمل اخلاص کے ساتھ ہو، قرآن پاک کہتا ہے: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [1] اور پیغمبر علیہ السلام کی حدیث ہے کہ «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ إِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى» [2] کہ سارے اعمال کی صحت اور قبولیت نیت پر ہے۔ تو ہر شخص کو اس کے عمل سے کیا ملے گا؟ جو وہ نیت کرے گا۔ عمل چھوٹا ہو، بڑا ہو اس کی نیت پر موقوف ہے۔ حدیث میں ہجرت کی مثال ہے۔ کوئی بندہ ہجرت کرے اللہ کے لیے، اس کو اس کا اجر ملے گا اور کوئی ہجرت کر رہا ہے دنیا کے لیے، اس کو کوئی ثواب اور کوئی اجر نہیں ملے گا، حالانکہ عمل برابر ہے۔ دونوں نے گھر کو چھوڑا اور وطن کو چھوڑا، ایک مخصوص مقام پر گئے، دونوں کا چلنا برابر ہے، چھوڑنا برابر ہے، وہاں پہنچنا برابر ہے، لیکن ایک کا عمل مقبول

[1] البينة 5:98. [2] صحيح البخاري، حديث:1.

ہے اور ایک کا مردود۔ جس کا مقبول ہے اس کا مقبول ہونا اس کی نیت کے اخلاص کی بنا پر ہے اور جس کا مردود ہے وہ اس لیے مردود ہے کہ وہ مخلص نہیں تھا، ریا کار تھا، دنیا دار تھا۔ حدیث میں مجاہد کی مثال آتی ہے۔ «رُبَّ قَتِيلٍ بَيْنَ الصَّفَّيْنِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِنِيَّةٍ» [1] ایک شخص مقتول ہو کر گر پڑا دو صفوں کے بیچ میں ایک اسلام کی صف، دوسری کفار کی صف۔ معنی یہ شخص صف اول کا مجاہد تھا۔ وہیں ڈٹ کر کھڑا رہا، بھاگا نہیں، وہیں کھڑا رہا، لڑتا رہا حتیٰ کہ شہید ہو کر گر پڑا۔ نیکی بہت بڑی ہے۔ صف اول کا مجاہد تھا، وہیں گر گیا۔ فرمایا کہ عمل تو بہت بڑا ہے ظاہری طور پر لیکن «وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِنِيَّةٍ» اس کی نیت کا حال اللہ جانتا ہے۔ اس کا یہ سارا عمل اگر اخلاص پر قائم ہے تو اللہ قبول کرے گا، اخلاص پر قائم نہیں ہے اتنے بڑے عمل کی اللہ کے ہاں کوئی قیمت نہیں ہوگی۔ چنانچہ قیامت کے دن یہ میزان قائم ہوگا۔ اس میزان میں عمل کی گنتی کے بعد عمل کا معیار چیک کیا جائے گا۔ معیار کے لیے پہلی چیز اخلاص ہے۔ اخلاصِ عمل۔ اخلاص اگر موجود ہے تو میزان اس عمل کو تولے گا، اس کا وزن ہوگا۔ اخلاص اگر مفقود ہے تو میزان اس عمل کو وزن کے قابل نہیں سمجھے گا۔ وہ عمل مسترد ہے۔ اللہ پاک کا فرمان: ﴿وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ﴾ [2] کچھ لوگوں پر قیامت کے دن ایسے فیصلے ظاہر ہوں گے جس کی ان کو توقع نہیں ہوگی۔ وہ نیکیاں لا کر خوش ہوں گے۔ ان کے پاس نیکیوں کے ڈھیر ہیں، مگر چونکہ اخلاص نہیں تھا، میزان نے ایسا فیصلہ سنا دیا کہ ان کے سارے عمل جو ریاکاری پر قائم تھے مسترد ہو گئے۔ انھیں کسی وزن کے قابل قرار نہیں دیا جائے گا۔ یہ پہلا معیار ہے۔ پہلا مرحلہ اخلاص کا ہے تو کتنے لوگ

[1] ضعیف الجامع، حدیث: 1404. [2] الزمر 47:39.

یہاں کامیاب ہوں گے۔ بہت سے لوگوں کا عمل یہاں مسترد ہو جائے گا۔ اعمال کا معیار چیک کرنے کے لیے جو دوسرا نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ اس کا یہ عمل ہمارے پیغمبر کی سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کی نمازیں پیغمبر ﷺ کے طریقے اور سنت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اس نے حج تو کیا، اخلاص بھی ہے لیکن حج ہمارے پیغمبر کے طریقے کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ عمل کا معیار ہے۔ اور معیار ان دو چیزوں پر قائم ہے۔ ایک اخلاص کی حفاظت، دوسرا پیغمبر علیہ السلام کی سنت کی متابعت۔ بتائیے کتنے وہ لوگ ہیں جو یہاں کامیاب ہوں گے؟ گنتی پوری ہو سکتی ہے لیکن معیار کے حساب میں بہت سے لوگ ناکام ہو جائیں گے۔ کسی کا اخلاص موجود نہیں، اگر اخلاص ہے تو سنت کی اتباع موجود نہیں۔ لہٰذا ہماری اہل الحدیث کی یہ دعوت ہے کہ اللہ کے لیے ہر عمل کی ان دو بنیادوں کو سمجھیں۔ ایک اخلاص جو کہ توحید کا حصہ ہے۔ دوسرا پیغمبر علیہ السلام کی سنت کی اقتدا۔ یہ دعوت صرف ہماری ہے، باقی ساری جماعتیں اور سارے عوام کی دعوت کا جو انتہائی امر ہے وہ ان کے اپنے بزرگ ہیں، اپنے پیرومرشد ہیں، اپنے اپنے امام ہیں، اپنی اپنی برادریاں ہیں، اپنی اپنی قومیں ہیں لیکن یہ صرف جماعت اہلحدیث کی خوبی ہے کہ ان کی دعوت اتباع رسول کی دعوت ہے۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ [1] اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔ اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وزن اعمال حق ہے۔ وزن اعمال کی تیاری کر کے آئیے، قیامت کے ہر مرحلے کی تیاری، اس مرحلے کے جو تقاضے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے کیجیے۔

[1] محمد 33:47.

کچھ عمل ایسے خاص ہیں جو اللہ کے میزان کو بھاری کرنے والے ہیں، ان میں سرفہرست توحید ہے، جس کی دلیل آپ نے سن لی کہ «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» کی ایک پرچی گناہوں کے ننانوے دفاتر پر بھاری پڑ جائے گی۔ معنی توحید کا بڑا وزن ہے۔ اس کے اور بھی دلائل ہیں۔ نبی ﷺ کی حدیث۔ آپ کا فرمان کہ «سُبْحَانَ اللّٰهِ نِصْفُ الْمِيزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ يَمْلَؤُهُ» [1] کہ سبحان اللہ آدھا میزان ہے اور الحمدللہ پورا میزان ہے۔ اس کا معنی یہ کہ جو شخص پوری زندگی سبحان اللہ پڑھتا رہا، الحمدللہ پڑھتا رہا، خالی پڑھنا نہیں بلکہ سمجھ کر کہ سبحان اللہ کیا ہے؟ اور سبحان اللہ میں میرے پروردگار کی کون سی توحید ہے؟ الحمدللہ کیا ہے؟ الحمدللہ کس توحید پر قائم ہے؟ اس فہم کے ساتھ پڑھتا رہا تو پوری زندگی اس پر قائم رہا اور عامل رہا تو اس کا یہ عمل اتنا عظیم ہے کہ اس کا سبحان اللہ پڑھنا اللہ تعالیٰ کے آدھے میزان کو بھر دے گا اور الحمدللہ پورے میزان کو بھر دے گا۔ جبکہ میزان کی صفت یہ ہے کہ اس کا ایک پلڑا اتنا بڑا ہے کہ اس میں ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں سما سکتی ہیں۔ فرشتوں نے میزان کو دیکھا اور کہا کہ ہماری صدیوں کی عبادت اس میزان کو نہیں بھر سکتی۔ یہ عقیدۂ توحید کی عظمت ہے۔ مسند احمد میں پیغمبر علیہ السلام کی حدیث ہے: «بَخٍ بَخٍ لِخَمْسٍ مَا أَثْقَلَهُنَّ فِي الْمِيزَانِ» پانچ چیزیں، کیا کہنا ان کا! وہ پانچ چیزیں اللہ کے میزان میں کتنی بھاری ہوں گی۔ وہ پانچ چیزیں کون سی؟ ایک سبحان اللہ، دوسری الحمدللہ، تیسری لا الہ الا اللہ، چوتھی اللہ اکبر اور پانچویں کسی شخص کا بیٹا فوت ہوجائے اور وہ صبر کرلے، اس کا صبر اللہ کے میزان میں بہت بھاری ہوگا۔ [2] تو سبحان اللہ، الحمدللہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر سب اللہ کی توحید کے کلمات

[1] مسند أحمد:5/365. [2] مسند أحمد:4/237.

ہیں۔ اس کا معنی اللہ کے میزان کو بھرنے والی جتنی بھی چیزیں، یعنی عمل ہیں ان میں سرفہرست توحید باری تعالیٰ ہے۔ اور پیغمبر علیہ السلام کی ایک حدیث ہے: «خَصْلَتَانِ هُمَا أَخَفُّ عَلَى الظَّهْرِ وَأَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ» دو خوبیاں پشت پر ہلکی ہیں اور اللہ کے میزان میں بھاری ہوں گی۔ کون کون سی؟ فرمایا کہ ایک خصلت «طُولُ الصَّمْتِ» لمبی خاموشی کہ ایک انسان زیادہ خاموش رہے، کم بولے، اپنے آپ کو عادی بنالے کم بولنے کا۔ اس کی یہ خصلت عمل میں ہلکی ہے، کتنی ہلکی ہے۔ تکلیف بولنے میں ہے خاموش رہنے میں نہیں ہے۔ خاموش رہنا آسان ہے۔ لیکن یہ خاموشی اللہ کے میزان میں بہت بھاری ہوگی۔ اور دوسرا «وَحُسْنُ الْخُلُقِ» اچھے اخلاق۔ [1] ایک اور حدیث میں ارشاد گرامی ہے کہ «مَا شَيْءٌ أَثْقَلَ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ» [2] کہ اچھے خلق سے زیادہ بھاری مومن کے میزان میں کوئی چیز نہیں ہوگی۔ پیغمبر علیہ السلام کی اقتدا اور اتباع بھی اللہ کے میزان میں بھاری ہوگی۔

پیغمبر علیہ السلام کی دو حدیثوں کو سامنے رکھیں۔ اس سے بات واضح ہوجائے گی۔ ایک آپ کا ارشاد «إِنَّهُ لَيَأْتِي الرَّجُلُ الْعَظِيمُ السَّمِينُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يَزِنُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ» [3] اللہ کے میزان میں قیامت کے دن ایک بھاری بھرکم شخص کو لایا جائے گا، موٹا تازہ، لمبا اونچا، اس کو میزان میں رکھا جائے گا، تولا جائے گا، اس کا وزن ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا۔ وزن سے خالی۔ ایک دوسرے شخص کا ذکر ہے جس کا نام عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ درخت پر مسواکیں

[1] شعب الإيمان للبيهقي، حديث:4941، و مسند أبي يعلى:6/53، حديث:3298. [2] جامع الترمذي، حديث:2002. [3] صحيح البخاري، حديث:4729، و صحيح مسلم، حديث:2785.

توڑنے چڑھے، صحابہ کو ان کی پنڈلیاں نظر آگئیں۔ صحابہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ پتلی ٹانگیں دیکھ کر ہنسنے لگ گئے۔ لاغر تھے، کمزور تھے، دبلے اور نحیف تھے۔ لیکن بہادر تھے بزدل نہیں تھے۔ معرکۂ بدر میں سردار قریش ابوجہل کے سینے پر سوار ہو کر اس کا سر کاٹا۔ شجاع اور بہادر لیکن لاغر قسم کے پتلے۔ صحابہ ٹانگیں دیکھ کر ہنس پڑے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَهُمَا أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ أُحُدٍ» [1] عبداللہ کی دو ٹانگیں قیامت کے روز اللہ کے میزان میں احد پہاڑ سے بھاری ہوں گی۔ اب یہ میزان ایک ہی ہے۔ اس میں ایک بھاری بھرکم انسان کو تولا گیا اور وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ دو پتلی ٹانگوں کو رکھا جائے گا اور یہ دو ٹانگیں احد پہاڑ سے زیادہ بھاری ہیں۔ فرق کیا ہے ان دو حدیثوں میں؟ حالانکہ میزان تو بھاری چیز کو بھاری اور ہلکی چیز کو ہلکا ظاہر کرتا ہے۔ یہاں فرق کیا ہے؟ یہاں فرق ایک ہی ہے اور وہ ہے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا۔ عبداللہ کون ہے؟ عمل میں، اتباع سنت میں، اٹھنے بیٹھنے میں، کھانے پینے میں، بولنے چالنے میں، چلنے پھرنے میں سب سے زیادہ پیغمبر ﷺ کے مشابہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ ہے وزن۔ تو وزن سنتِ رسول کا ہوگا۔ اس لیے قرآن نے جہاں اتباعِ پیغمبر کی دعوت دی کہ میرے پیغمبر کی اتباع کرو، تو اس کے بعد فوراً وزن اعمال کا ذکر کیا۔ اس میں یہ اشارہ اور تنبیہ ہے کہ اللہ کے میزان میں سنت کی اتباع بہت بھاری ہے۔ تو توحید وسنت کی دعوت ہمارے منہج کی خصوصیت ہے۔ بحمد للہ یہ اہل الحدیث کی دعوت ہے کہ اللہ کی توحید خالص کی طرف آجاؤ۔ رسول اللہ کی سنت کی اتباع کی طرف آجاؤ۔ تو یہ حدیثِ میزان، جس میں عمل کے بھاری اور ہلکا ہونے

[1] مسند أحمد: 420/1.

کا ذکر موجود ہے، ہمیں دعوتِ فکر دے رہی ہے کہ ہم ان نصوص کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی تیاری کریں۔ میزان کے حوالے سے ایک آخری بات حدیث کی روشنی میں تاکہ میزان کا ایک اور تقاضا سامنے آجائے۔ وہ یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے: «فَتُوزَنُ الْحَسَنَاتُ وَ السَّيِّئَاتُ فَمَنْ رَّجَحَتْ سَيِّئَاتُهُ عَلٰى حَسَنَاتِهِ مِثْقَالَ حَبَّةٍ دَخَلَ النَّارَ وَ مَنْ رَّجَحَتْ حَسَنَاتُهُ عَلٰى سَيِّئَاتِهِ مِثْقَالَ حَبَّةٍ دَخَلَ الْجَنَّةَ» [1] فرمایا کہ قیامت کے دن نیکیاں اور گناہ تولے جائیں گے۔ جس کی نیکیاں اس کے گناہوں سے (ایک رائی) کے دانے کے برابر بڑھ گئیں، وہ جنتی ہے اور جس کے گناہ نیکیوں سے (ایک رائی) کے دانے کے برابر بڑھ گئے، وہ جہنمی ہے۔ معنی یہ کہ میزان جب قیامت کے دن بندوں کے اعمال تولے گا تو ایک رائی کے دانے کے فرق کو بھی ظاہر کرے گا۔ ایک رائی کے دانے کے برابر گناہ اگر بڑھ گیا اور نیکیاں کم ہوگئیں، جہنم کا فیصلہ ہے۔ اب بندہ وہاں افسوس کرے گا: کاش! وہ نیکی کر لی ہوتی۔ ایک نیکی میں نے چھوٹی سمجھ کر چھوڑ دی تھی۔ کاش! وہ کر لی ہوتی تو آج میری نیکیاں گناہوں سے بڑھ جاتیں۔ ایک رائی کے دانے کے برابر یہ فرق سامنے آئے گا۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی نیکی کو حقیر نہ جانو۔ حقیر جان کر چھوڑ نہ دو۔

ایک اعرابی نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے پاس آیا اور کہا کہ دل سخت ہے، اس کا علاج کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا» [2] کسی نیکی کو حقیر نہ جان۔ جو میزان کا حساب ہے، چونکہ یہ اوزان ایک رائی کے دانے کے برابر فرق کو ظاہر کرے گا تو پھر اس کے لیے ضروری ہے ہم کسی نیکی کو چھوٹا نہ سمجھیں بلکہ جو

[1] فتح الباري: 10/393، 394. [2] صحيح مسلم، حديث: 2626.

نیکی ہو اس کو اللہ کی رضا کے لیے کر گزریں۔ ہوسکتا ہے وہ نیکی ہی کل قیامت کے دن فرق بن جائے اور ہماری کامیابی کی بنیاد بن جائے۔ مثال کے طور پر ہم مسجد میں آتے ہیں، جماعت کھڑی ہے، امام سجدے میں ہے۔ اب ہم گپیں مار رہے ہیں کہ امام سجدے سے اٹھے اور قیام میں آئے پھر جماعت میں شامل ہوں۔ یہ سجدے کی تحقیر ہے۔ اس سجدے کو آپ حقیر جان رہے ہیں۔نہیں، وہ نیکی کر گزرو۔ ہوسکتا ہے وہ سجدہ ہی، اس سجدے کا شوق ہی کل اللہ کے دربار میں مغفرت اور درجات کی بلندی کا باعث بن جائے۔ انسان جو سجدہ کرتا ہے اس سجدے پر اس کے درجے اونچے ہوتے ہیں۔ جس سجدے کو آپ حقیر جان کر چھوڑ رہے ہیں کہ قیام میں امام آئے گا، ساتھ شامل ہو جائیں گے، اس وقت تک کچھ گپیں مار لیں۔ ہوسکتا ہے یہی سجدے کا چھوڑنا کل قیامت کے دن ندامت کا باعث بن جائے۔ اور سجدے کو چھوڑنا صرف سجدے کو چھوڑنا نہیں ہے بلکہ پیغمبر علیہ السلام کے امر کی خلاف ورزی بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: جب تم مسجد میں آؤ، جماعت کھڑی ہو، امام کو جس حال میں پاؤ اسی حال میں مل جاؤ۔ [1] انتظار نہ کرو کہ امام قیام میں آئے تب شامل ہوں۔نہیں، جس حال میں امام ہو اسی حال میں مل جاؤ، ہوسکتا ہے وہ سجدہ جس کو حقیر جان کر آپ نے چھوڑ دیا وہ سجدہ ہی کل قیامت کے دن وزن اعمال کے موقع پر ایک رائی کے دانے کے برابر نیکیوں کے فرق کو ظاہر کردے۔ تو یہ وزنِ اعمال کے اہم تقاضوں میں سے ایک تقاضا ہے کہ اس کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی میزان کی تیاری کریں اور کسی عمل کو چھوٹا نہ سمجھیں۔ بعض اوقات چھوٹا عمل انسان کی نجات کا باعث بن جاتا ہے۔ ایک فاحشہ

[1] جامع الترمذي، حديث:591.

عورت نے پیاسے کتے کو پانی پلا دیا، اللہ نے اس کو معاف کر دیا [1] اور اس عورت کو آئندہ مستقل تقویٰ اور ایمان کی توفیق دے دی۔ صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق ایک شخص نے راہ چلتے ایک جھاڑی کو ہٹا دیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کے تمام گناہوں کو معاف کر دیا۔ [2] اور بخاری ہی کی حدیث ہے کہ ایک عورت نے ایک بلی کو باندھ دیا۔ وہ بھوکی مر گئی، اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم میں ڈال دیا۔ [3] اس عورت کو بھی اور اس بلی کو بھی۔ عورت کو اس لیے تاکہ اس کو سزا ملے اور بلی کو اس لیے کہ وہ بلی اس کو ہمیشہ کے لیے نوچتی رہے اور کاٹتی رہے۔ [4] تو یہ ہیں اعمال۔ کسی عمل کو چھوٹا نہ سمجھو۔ پیغمبر ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے، فرمایا کہ دونوں میں عذاب ہو رہا ہے۔ ایک چغل خور تھا اور دوسرا استنجے کی حفاظت نہیں کرتا تھا۔ [5] اس عمل کو چھوٹا سمجھ کے لوگ چھوڑ دیتے تھے۔ تو وزن اعمال کی تیاری کا تقاضا یہ ہے کہ کسی عمل کو حقیر نہ جانا جائے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ آخری باب وزن اعمال کا بہت سے مقاصد کے تحت قائم کیا ہے۔ معتزلہ کا رد بھی ہے جو میزان کو نہیں مانتے۔ یہ لوگ بے چارے مسکین، اس بات کو مانتے ہیں جس کو ان کی عقل تسلیم کر لے۔ حالانکہ نقل اور شریعت عقل پر مقدم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ترازو نماز کیسے تول سکتا ہے؟ ترازو روزہ کیسے تول سکتا ہے اور ترازو حج کیسے تول سکتا ہے؟ نہ نماز کا جسم ہے، نہ روزے کا، نہ حج کا۔ ترازو تو ان چیزوں کو تول سکتا ہے جن کا جسم ہوگا۔ چینی کا جسم ہے ترازو اس کو تول سکتا ہے۔ لیکن چینی میں موجود مٹھاس کا جسم نہیں ہے، مٹھاس کا وزن نہیں ہوسکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ

[1] صحيح البخاري، حديث:3467، و صحيح مسلم، حديث:2245. [2] صحيح البخاري، حديث:2472. [3] صحيح البخاري، حديث:2365. [4] مسند أحمد: 51/6. [5] صحيح البخاري، حديث:216.

عقل کے اندھو! اصل بات یہ ہے کہ یہ خبر کس نے دی کہ ہم اعمال تولیں گے؟ اللہ تعالیٰ نے، تو کیا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر نہیں ہے۔ جب اس نے خبر دے دی، ہم اعمال تولیں گے تو ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تولنے پر قادر ہے۔ نقل، عقل پر مقدم ہے۔ اور آج تم نے خود ایسی چیزوں کو تول کر دکھا دیا جن کا جسم اور وجود نہیں ہے۔ جیسے تھرمامیٹر انسان کے بخار کو تول دیتا ہے، حالانکہ بخار کا کوئی وجود نہیں۔ گاڑی میں میٹر گاڑی کی رفتار کو تولتا ہے، حالانکہ رفتار کا کوئی جسم نہیں۔ گاڑی میں ایک اور میٹر ہے جو گاڑی کی گرمی کو تولتا ہے۔ گاڑی کس قدر ہیٹ اپ ہورہی ہے۔ اور گرمی کا کوئی وجود نہیں۔ تم نے ایسے آلات تیار کر لیے جو ایسی چیزوں کو تول رہے ہیں جن کا جسم نہیں، کس کی توفیق سے؟ اس کی اپنی قدرت کیسی ہوگی؟ اور پھر یہ رد ہے فرقہ جبریہ پر جو کہتے ہیں کہ ہر انسان اللہ کی تقدیر کے آگے مجبور محض ہے۔ کوئی نیکی کر رہا ہے تو اس لیے کر رہا ہے کہ تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ برائی کر رہا ہے تو اس لیے کر رہا ہے کہ تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ نیکی کرنے والے کا نیکی میں کوئی کمال نہیں اور گناہ کرنے والے کا اس گناہ میں کوئی عیب نہیں کیونکہ تقدیر کے آگے یہ بھی مجبور ہے اور وہ بھی۔ ہوا چلتی ہے، پتے ہلتے ہیں، اس میں پتوں کا کوئی کمال نہیں، ہوا ان کو ہلا رہی ہے۔ تو جو انسان کر رہا ہے، وہ سب کا سب تقدیر کے آگے مجبور ہو کر کر رہا ہے۔ یہ فرقہ جبریہ ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا کہ اللہ اعمال کو تولے گا، انسان کے عمل کو تولے گا، نماز کو، روزوں کو اور گناہوں کو تولے گا اور تول کر بندے کا حساب لے گا۔ اگر انسان مجبور محض ہے تو اس تولنے کا معنی کیا ہے؟ اس حساب کا معنی کیا ہے؟ حساب اور پھر تولنے کا معنی یہ ہے کہ بندہ مجبور محض نہیں ہے۔ کچھ امور میں مجبور محض ہے اور وہ

دنیا کے امور ہیں۔ کس نے کب پیدا ہونا ہے، کتنا جینا ہے؟ کتنی سانسیں؟ کتنا پینا ہے؟ کیا کھانا ہے؟ کتنے دانے چبانے ہیں؟ یہ سب کا سب تقدیر میں لکھا ہوا ہے اور انسان مجبور ہے۔ لیکن ہدایت اور گمراہی کا معاملہ، اللہ تعالیٰ نے سمجھانے کے لیے انبیاء بھیجے اور انسان کو اختیار دیا۔ یہ راستہ جنت کا ہے، یہ جہنم کا ہے۔ چاہو اس راستے کو اختیار کرلو اور چاہو اس کو اختیار کرلو۔ اب بندہ جو چاہے اختیار کرلے۔ اور بندے کا جو اختیار ہے، وہ اللہ کی مشیت کے تحت ہے۔ لیکن اختیار میں آزادی ضرور ہے۔ آیات بینات آگئیں۔ راستے واضح ہوگئے، حجت قائم ہوگئی، اس میں انسان مجبور محض نہیں ہے۔ راستے دکھا دیے گئے۔ اب انسان نے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا ہے۔ ہاں! یہ بات ہمارے عقیدے میں شامل ہے کہ جو انتخاب وہ کرے گا، وہ اللہ کی مشیت کے تحت ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ غیر معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ہدایت کے لیے چنتا ہے تو کیوں چنتا ہے؟ یہ اللہ کا راز ہے، ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ کسی بندے کو اللہ نے گمراہ کردیا، کیوں گمراہ کیا؟ یہ اللہ کا راز ہے، ہمیں اس کا علم نہیں۔ ہمارا اس تقدیر پر ایمان لانا فرض اور واجب ہے۔ آگے ہم خاموش رہیں، اس معنی میں پیغمبر علیہ السلام کی حدیث ہے: «فَإِذَا بَلَغَ ذٰلِكَ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ» [1] جب تقدیر پر بات چلتے چلتے یہاں تک پہنچ جائے تو اللہ سے پناہ مانگو اور چپ کر جاؤ۔ تو جبریہ پر رد ہے، وہ کہتے ہیں: انسان مجبور محض ہے۔ مجبور محض کا حساب کیوں؟ اور اس کے اعمال کیوں تولے جارہے ہیں؟ اس کا معنی بندے کو بھی اختیار دیا گیا ہے اور بندہ جو منتخب کرتا ہے، اس کا انتخاب اللہ کی توفیق اور اس کی مشیت کے ساتھ ہے۔

[1] صحیح مسلم، حدیث: 134.

آگے امام بخاری ﷫ نے ''قسط'' کے لفظ کے تعلق سے ایک بات کی ہے اور یہ عربی لغت کا تنوع ہے۔ «يُقَالُ: الْقِسْطُ مَصْدَرُ الْمُقْسِطِ» کہ لفظ قسط یہ مقسط کا مصدر ہے۔ باب ہے: «أَقْسَطَ يُقْسِطُ إِقْسَاطًا» ثلاثی مزید، باب افعال۔ اس کے دو مصدر ہیں: ایک اقساط اور دوسرا قسط۔ «أَقْسَطَ يُقْسِطُ إِقْسَاطًا وَ قِسْطًا» یہ دونوں ایک ہی باب کے مصدر ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ قسط باب «قَسَطَ يَقْسِطُ» کا مصدر ہے۔ اَقْسَطَ يُقْسِطُ إِقْسَاطًا اور قَسَطَ يَقْسِطُ قِسْطًا۔ یہ مصدر ہیں، مادہ دونوں کا ایک ہے: ق۔س۔ط۔ لیکن معنی کا فرق ہے۔ بالکل متضاد، بالکل مخالف۔ مُقْسِطٌ کا معنی عَادِلٌ اور قَاسِطٌ کا معنی ظَالِمٌ۔ أَقْسَطَ کا معنی عَدَلَ، عدل کیا اور قَسَطَ کا معنی جَارَ، ظلم کیا۔ یہ عربی لغت کا تنوع ہے۔ عربی لغت تمام لغات کی امام ہے۔ اس کے پڑھنے میں بڑی وسعت اور بڑی لذت ہے۔ بعض اوقات صرف حروف کی تبدیلی سے معانی تبدیل ہو رہے ہیں۔ اور یہ کمال صرف عربی لغت کا ہے۔ تو أَقْسَطَ اور قَسَطَ یہ معنی کا فرق کیوں ہے؟ أَقْسَطَ باب افعال ہے اور باب افعال کے خصائص میں سے خاصہ ہے اعطائے ماخذ، جو اس صیغے کا ماخذ ہے وہ کسی کو دینا۔ اور قسط باب ثلاثی مجرد کا مصدر ہے اور ثلاثی مجرد کے مصدر کے باب کی خاصیت ہے سلب ماخذ۔ جو اس فعل کا ماخذ ہے اس کو چھیننا۔ تو اقسط میں چونکہ اعطائے ماخذ ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا: «أَقْسَطَهُ أَيْ أَعْطَاهُ قِسْطَهُ» فلاں نے فلاں کو اس کا حصہ دے دیا اور یہ عدل ہے۔ اور قسط کا معنی «أَيْ سَلَبَ مِنْهُ قِسْطَهُ» کہ فلاں نے فلاں سے اس کے حصے کو چھین لیا اور یہ ظلم ہے۔ تو قاسط میں چھیننے کا معنی ہے جو کہ ظلم ہے اور «أَقْسَطَ يُقْسِطُ» میں دینے کا معنی ہے جو کہ عدل ہے۔ اور آگے امام بخاری ﷫ نے اپنی سند ذکر کی:

حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ إِشْكَابٍ» یہ امام بخاری کے شیخ ہیں۔ یہ امام بخاری کا انفراد ہے کہ کتب ستہ کے جو پورے مؤلفین ہیں ان میں صرف امام بخاری ہی کے شیخ ہیں۔ امام بخاری کے شیوخ کا سلسلہ جیسا کہ آپ نے سنا بڑا وسیع تھا۔ ایک ہزار اسی ان کے استاد تھے۔ اب غور کریں کس طرح انھوں نے استاد کیے ہوں گے؟ کہاں کہاں گئے ہوں گے؟ اتنے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ آج جہازوں کا دور ہے، گاڑیوں کا دور ہے، ہم کہاں کہاں جا سکتے ہیں۔ اپنے استاد ہم شمار کریں تو بہت حد تک بیس ہو جائیں گے، تیس ہو جائیں گے، اس سے زیادہ نہیں۔ مگر وہ دور، پیدل چلتے، کبھی گھوڑے کی سواری، کبھی گدھے کی سواری۔ ایک ہزار اسی ان کے مشائخ۔ کس طرح انھوں نے طلب علم کی محنت کی۔ احمد بن اشکاب ان کے استاد ہیں۔ اور یہ حدیث صحیح بخاری میں تین مقامات پر ہے۔ اور تینوں مقامات پر مختلف مشائخ سے ہے۔ کتاب الدعوات میں ہے اور وہاں امام بخاری کا شیخ زہیر بن حرب ہے۔ اور کتاب الأیمان والنذور میں بھی ہے اور وہاں امام بخاری کے شیخ قتیبہ بن سعید ہیں۔ ان تینوں مقامات پر امام بخاری کے مختلف مشائخ ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح بخاری کے متن اور اسانید پڑھنے کی بڑی لذت ہے۔ اور طلبہ کو آج فتح الباری ملی، جس ساتھی نے دی اللہ اس کو جزائے خیر دے۔ یہ کتاب ان شاء اللہ آپ کے گھر کا سب سے قیمتی تحفہ ہوگا۔ اور میری یہ آپ کو نصیحت ہے کہ ہر روز کم از کم ایک صفحہ یا ایک باب صحیح بخاری کا فتح الباری کے ساتھ ضرور پڑھیں۔ شرح کے ساتھ اور یہ پڑھتے رہیں۔ ان شاء اللہ! یہ روزانہ پڑھنا آپ کے علم میں برکت کا باعث اور علم میں اضافہ ہوگا۔ صحیح بخاری کی اسانید، ان اسانید کے نکات آپ پر واضح ہوں گے۔ لیکن ساتھ آپ کو علم کا ایک شوق پیدا ہوگا۔

کتاب الایمان میں امام بخاری نے باب قائم کیا: «بَابُ ظُلْمٌ دُونَ ظُلْمٍ» اس کے تحت ایک حدیث نقل کی دو سندوں کے ساتھ۔ پہلی سند میں امام بخاری کے شیخ ابوالولید الطیالسی ہیں اور ان کے شیخ شعبہ ہیں، یعنی امام بخاری اور شعبہ کے مابین ایک واسطہ ہے ابوالولید کا۔ اس کے بعد وہی حدیث ذکر کی ایک اور سند کے ساتھ اور وہ یوں ہے کہ امام بخاری کے شیخ بشر بن خالد اور ان کے شیخ محمد بن جعفر اور ان کے شیخ شعبہ ہیں [1] تو پہلی سند میں شعبہ اور بخاری کے مابین ایک واسطہ ہے۔ دوسری میں دو واسطے ہوگئے۔ یعنی پہلی سند عالی تھی، دوسری نازل اور سافل ہوگئی۔ یہ سند عالی کے بعد سند نازل کو ذکر کیوں کیا۔ ہر محدث کی یہ خواہش ہے کہ اس کا واسطہ اللہ کے پیغمبر تک کم ہو اور یہاں بڑھ رہا ہے۔ پہلی سند میں امام بخاری اور شعبہ کے مابین ایک واسطہ ابوالولید کا، دوسری میں دو واسطے بشر بن خالد اور محمد بن جعفر کا۔ تو سند عالی کے بعد سند نازل ذکر کیوں کی؟ سند علو تو محدثین کا مطلوب ہے۔ حافظ سلیم صاحب جو بقیع بن مخلد کا واقعہ بیان کررہے تھے کہ امام احمد بن حنبل سے ملنے کے لیے اندلس سے بغداد گئے۔ جن سات حدیثوں کا حوالہ دیا، وہ سات حدیثیں بقیع کے پاس موجود تھیں۔ متن موجود تھا، لیکن ایک واسطہ کم کرنے گئے تھے۔ امام احمد کے پاس وہ سات حدیثیں سند عالی کے ساتھ تھیں اور ان کے پاس سند نازل کے ساتھ تھیں۔ متن موجود تھے تو اپنا واسطہ کم کرنے کے لیے وہ چلے اندلس سے بغداد۔ چھ ماہ جانے میں اور چھ ماہ آنے میں۔ پھر پورا واقعہ آپ نے سنا جب وہاں پہنچے، امام صاحب جیل میں بند تھے۔ اور پھر کس طرح حیلہ سوچا، تدبیر کی اور فقیر بن کر روزانہ وہاں جاتے اور حدیثیں سنتے۔ اور

[1] صحيح البخاري، حديث: 32.

انھوں نے باقی واقعہ بیان نہیں کیا۔ بقیع بن مخلد ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور روز وہیں سے اپنا بھیس بدلتے اور فقیر بن کر اور کاسۂ گدائی ہاتھ میں لے کر نکلتے۔ سفر پورا ہوگیا۔ حدیثیں پوری سن لیں۔ پھر بیمار ہوگئے۔ ہوٹل کے مالک نے ان کو دیکھا اور کہا کہ آپ اللہ کے لیے میرے ہوٹل کو چھوڑ دیں۔ تم بیمار ہوگئے ہو، ہوسکتا ہے تمھارا انتقال ہوجائے تو میرے ہوٹل کی شہرت خراب ہوگی کہ لوگ یہاں آتے ہیں اور آکے مرجاتے ہیں۔ بقیع بن مخلد نے کہا: میں کہاں جاؤں؟ اتنا شدید مرض ہے کہ میں چل پھر نہیں سکتا، حرکت نہیں کرسکتا۔ کئی علماء نے سفارش کی کہ آپ نہ نکالیں۔ نیک آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ نیک کہاں ہے؟ نیک ہوتا تو میں اس کو رکھ لیتا۔ یہ نیک کہاں ہے؟ یہ تو روزانہ اپنا بھیس بدلتا ہے اور فقیر بن کر بھیک مانگتا ہے، «اَلْأَجْرُ مِنَ اللّٰهِ، اَلْأَجْرُ مِنَ اللّٰهِ» پکارتا جاتا ہے: کہ لوگو! اللہ سے اجر لے لو، اللہ سے اجر لے لو۔ یہ تو بھکاری ہے، یہ عالم کہاں ہے؟۔ اسے کیا معلوم بقیع بن مخلد کی حقیقت کیا تھی۔ حقیقت تب کھلی جب اسی دوران امام احمد بن حنبل رہا ہوگئے۔ رہا ہوتے ہی سب سے پہلے پوچھا: بقیع کہاں ہے؟ بغداد میں ہیں یا واپس چلے گئے۔ لوگوں نے کہا: موجود ہیں لیکن بیمار ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟ فلاں ہوٹل میں۔ امام احمد بن حنبل خود اس کی بیمار پرسی کرنے کے لیے گئے۔ اب اس محدث کا یہاں آنا کتنا باعث برکت بن گیا کہ دنیا میں یہ بات پھیل گئی کہ فلاں شخص کے ہوٹل میں امام احمد بن حنبل گئے تھے۔ اب بغداد میں جو محدث آتا وہیں قیام کرتا، اسی ہوٹل میں ٹھہرتا، اس کی شہرت بن گئی اور اس شخص کا کاروبار پھیل گیا۔ یہ محدثین کی برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ان کے قدموں سے، ان کے قدموں کی برکت سے لوگوں کو نوازتا ہے۔ تو میں نے یہ ایک مثال اس لیے

پیش کی کہ سند عالی کے بعد سند نازل کیوں ذکر کی؟

یہاں ابن حجر نے تھوڑی سی بحث کی ہے۔ اور یہ فرمایا ہے کہ اصل میں سند نازل میں ایک نکتہ ہے۔ پہلی سند کی اہمیت یہ ہے کہ وہ عالی ہے، دوسری کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں ایک اور نکتہ ہے۔ اگرچہ نازل ہے لیکن یہاں شعبہ سے روایت کرنے والا محمد بن جعفر ہے جس کا لقب غُنْدَر ہے۔ اور شعبہ کے جتنے شاگرد تھے ان سب میں اثبت اور اتقن یہ غندر ہے۔ تو وہاں قابل توجہ امر سند کا علو ہے اور یہاں نکتہ یہ ہے کہ شعبہ کا وہ شاگرد ہے جو «أَثْبَتُ النَّاسِ فِي شُعْبَةَ» ہے۔ شعبہ کے تمام شاگردوں میں اس سے بڑا ثقہ کوئی نہیں۔ حتیٰ کہ علی بن مدینی کا قول ہے: محمد بن جعفر عَنْ شعبة یہ طریق میرے نزدیک عبدالرحمٰن بن مہدی کے طریق سے اولیٰ ہے۔ عبداللہ بن مبارک کا قول ہے: «إِذَا اخْتَلَفَ النَّاسُ فِي شُعْبَةَ» اگر شعبہ کی کسی حدیث میں محدثین کو اختلاف ہو تو «كِتَابُ غُنْدَرٍ حَكَمٌ بَيْنَهُمْ» تو غندر کی کتاب ان میں حَکَم ہوگی۔ اس کا معنی اس طریق کی ایک الگ خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں شعبہ کا شاگرد غندر ہے۔ اور غندر شعبہ کے شاگردوں میں سب سے اتقن، سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعبہ کا ربیب (گود میں پالا ہوا بیٹا) تھا۔ امام شعبہ کی دوسری شادی ہے تو دوسری بیوی کا یہ بیٹا تھا۔ جب اس سے شادی ہوگئی تو یہ بیٹا بھی ان کی تربیت میں آ گیا۔ تو بچپن سے آخر تک امام شعبہ کے ساتھ رہا۔ اتنی رفاقت، اتنی عمر ساتھ دینا، اس لیے یہ «أَثْبَتُ النَّاسِ فِي شُعْبَةَ» ہے۔ اب یہاں ایک اور اشکال وارد ہوتا ہے کہ غندر محمد بن جعفر یہ متحمل غفلہ ہے۔ اس کو بعض محدثین نے مغفل کہا ہے کہ یہ حدیث میں غافل تھا، غفلت کا شکار تھا۔ ایک مغفل راوی کی

حدیث بخاری میں کیسے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح بخاری میں محمد بن جعفر کی تمام روایتیں شعبہ سے ہیں اور محمد بن جعفر شعبہ میں اثبت الناس ہے۔ جو شبہ ہے یہاں زائل ہوگیا کیونکہ شعبہ سے روایت کرنے میں غندر اوثق الناس ہے۔ تو یہ غفلت کا اشکال ختم ہوگیا۔ لیکن ایک اشکال اور قائم ہوگیا اور وہ یہ کہ صحیح بخاری میں دو مقامات پر غندر کی روایت غیر شعبہ سے ہے۔ ایک داود بن ابی ہند اور دوسرے معمر بن راشد سے۔ دو مقامات پر غندر کی حدیث غیر شعبہ سے ہے۔ یہاں کیا جواب دو گے؟ یہاں جواب یہ ہے کہ امام بخاری نے جب یہ دیکھا کہ یہاں غندر کی روایت شعبہ سے نہیں ہے تو اس روایت کی کئی متابعتیں نقل کیں، کئی اسانید نقل کیں۔ ان اسانید سے اس روایت میں متابعت ثابت کی اور قائم کی۔ تو بحمد اللہ صحیح بخاری کی تمام اسانید اشکال سے پاک اور خالی ہیں۔ تو یہ حدیث امام بخاری کی سند سے احمد بن اشکاب، ان کے شیخ محمد بن فضیل، ان کے شیخ جو ہیں عمارہ اور ان کے شیخ ابوزرعہ۔ ابوزرعہ رازی نہیں ہیں یہ۔ بعض لوگوں کو وہم ہوتا ہے رازی ہیں۔ ہم نے بعض لوگوں سے سنا۔ یہ رازی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ابوزرعہ نبی ﷺ کے صحابی جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں۔ اور اس حدیث کے راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ پیغمبر علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ حافظ الحدیث اور محدث اول، جنھوں نے ہزاروں حدیثیں پیغمبر علیہ السلام سے روایت کیں۔ پانچ ہزار پانچ سو سے زائد ان کی احادیث ہم تک پہنچیں۔ محدث، بڑی چوٹی کے محدث۔ جن کی خصوصیت یہ ہے کہ یمن سے آئے تھے۔ اسلام قبول کیا اور پھر پوری عمر یمن کی جانب جھانک کر نہیں دیکھا بلکہ پیغمبر علیہ السلام کی غلامی اور صحبت میں زندگی گزاری۔ بھوکے رہتے، پیاسے رہتے مگر پیغمبر علیہ السلام کی چوکھٹ نہیں چھوڑتے تھے۔ بعض اوقات بھوک

سے بے ہوش ہوکر گر جاتے، لوگ سمجھتے پاگل ہوگئے ہیں۔ فرماتے ہیں: مجھے کوئی جنون نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ بھوک اور پیاس کی بے ہوشی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود پیغمبر علیہ السلام کو چھوڑتے نہیں تھے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک دفعہ نبی ﷺ نے فرمایا: اپنے دامن کو بچھاؤ، انھوں نے بچھا دیا تو پیغمبر علیہ السلام نے دعا کی، پھر فرمایا کہ اس کو سمیٹ کر اپنے سینے سے مل لو۔ انھوں نے مل لیا۔ فرماتے ہیں: اس کے بعد مجھے کبھی کوئی حدیث، کوئی مسئلہ نہیں بھولا۔ [1] اتنا اتقان تھا، اللہ اکبر۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے یا کوئی قوم یہ کہے کہ یہ غیر فقیہ تھے تو یہ کتنا بڑا جرم ہوگا اور کتنا بھیانک اقدام ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس راوی سے اتنا عناد ہے کہ ان کی حدیثوں کو رد کرنے کے لیے باقاعدہ قواعد بنا دیے گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قاعدہ جو بنایا گیا ہے جس کی طرف کچھ اشارہ حافظ سلیم صاحب نے بھی کیا تھا، یہ قاعدہ صرف ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی عداوت میں بنایا گیا ہے۔ کوئی حدیث ایسی ہو جو رائے کے خلاف ہو، عقل کے خلاف ہو تو اس کے راوی کو دیکھیں گے کہ فقیہ ہے یا غیر فقیہ۔ اس کا راوی اگر غیر فقیہ ہوگا تو وہ حدیث حجت نہیں ہوگی۔ وہ حدیث قابل انکار ہوگی، قابل قبول نہیں ہوگی۔ اور غیر فقیہ کون ہے؟ انھوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہا۔ تو یہ سارا جو منصوبہ بنایا گیا اس صحابی کی شان میں توہین کرنے کے لیے، اس صحابی پر حملہ کرنے کے لیے، اللہ اکبر۔ اور یہ پیغمبر علیہ السلام کی احادیث کے خلاف ہے۔ اور اس تعلق سے آخری بات یہ عرض کروں گا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی محبت مسلک اہلحدیث کی حقانیت کی دلیل ہے۔ جو صحیح مسلم میں حدیث ہے: ایک بار پیغمبر علیہ السلام نے ابوہریرہ کو دیکھا اور دعا کی «اللّٰهُمَّ حَبِّبْ عُبَيْدَكَ هٰذَا، يَعْنِي أَبَا هُرَيْرَةَ، وَأُمَّهُ

[1] صحيح البخاري، حديث: 119.

وَ إِلَى عِبَادِكَ الْمُؤْمِنِينَ حَبِّبْ إِلَيْهِمُ الْمُؤْمِنِينَ» [1] یا اللہ! اپنے اس بندے سے محبت کر اور اس کی ماں سے بھی محبت کر۔ اپنے اس بندے کو اور اس کی والدہ کو اپنے مومن بندوں کا محبوب بنادے اور مومنوں کو ان کا محبوب بنا دے! معنی کیا ہوا؟ جس دل میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی محبت ہے، وہ دل مومن ہے اور جس دل میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی عداوت ہے، مخالفت ہے، وہ دل مومن نہیں ہوسکتا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا دل اور پیغمبر علیہ السلام کی حدیث، حدیث قدسی کہ جو لوگ «مَنْ عَادَىٰ لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ» [2] جو لوگ میرے کسی ولی سے عداوت کریں گے، ان سے میرا اعلان جنگ ہے۔

باقی حدیث آپ نے سن لی۔ اس کے دو کلمات ہیں اور تین خوبیاں ہیں۔ «كَلِمَتَانِ حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ» دو کلمے اللہ کو بڑے پیارے اور «خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ» زبان پر بڑے ہلکے۔ «ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ» اور کل قیامت کے دن اللہ کے میزان میں بھاری ہوں گے۔ وہ دو کلمے کیا ہیں؟ یہ ساری خبر ہے اور خبر کی تکمیل تشویق کے لیے ہے تاکہ پڑھنے والوں کو شوق پیدا ہو کہ وہ دو کلمے کیا ہیں؟ ان کو فوراً سنیں۔ اللہ کو پیارے، زبان پر ہلکے، میزان میں بھاری۔ تو آپ کہیں گے: جلدی بتاؤ وہ کلمے کون سے ہیں۔ وہ ہیں: «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ» اور «سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ» جو اللہ رب العزت کی پوری توحید اسماء و صفات کا مظہر اور ترجمان ہیں۔ «سُبْحَانَ اللّٰهِ» بنیاد ہے توحید اسماء و صفات میں تنزیہ کی کہ اللہ پاک ہے ہر عیب، ہر نقص سے۔ «وَبِحَمْدِهِ» اللہ کی تعریف کے ساتھ، ہر قسم کی تعریف اس کے لیے ہے۔ یہ ہر کمال کو شامل ہے اور یہ توحید صفات ہے۔ اللہ کے لیے ہر صفت کمال ہے۔ ہر صفتِ کمال

[1] صحيح مسلم، حديث: 2491. [2] صحيح البخاري، حديث: 6502.

اللہ ہی کے لیے ہے جس کی اساس الحمدللہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہر صفتِ نقص کی نفی ہے جس کی اساس سبحان اللہ ہے۔ «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ» اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے۔ یہ اللہ رب العزت کی پوری توحید کی ترجمان ہے۔ جس کے اشارے ہم نے اپنے درس کے دوران کردیے۔ یہ تنزیہ کیا ہے اور اثبات کمال کیا ہے؟ اور اللہ کس طرح ان کا مستحق ہے، اس پوری توحید کی معرفت سے سبحان اللہ کا علم حاصل ہوجائے گا۔ اللہ پاک یہ علم ہم کو عطا فرما دے۔ پوری توحید کا، اسماء وصفات کا۔

اور آخر میں اپنے طلبہ کو جن کی تعداد ماشاء اللہ 21 ہے۔ اور ان کی تعداد کو شامل کرنے کے بعد ہمارے اس معہد سے بارہ سال میں تقریباً ایک سو دو طلبہ یا اس سے کم و بیش فارغ ہوچکے ہیں اور بحمداللہ ہماری نگرانی میں سندھ میں یا کراچی میں کام کررہے ہیں۔ اللہ ان کو استقامت دے۔ ان کے لیے یہ آخری نصیحت ہے کہ وہ جو منہج سلف صالحین ہے، صحابہ کا منہج، تابعین کا، محدثین کا، اس کے ساتھ پوری وفاداری کریں۔ اور جو اہل السنہ کا شیوہ، اہل الحدیث کا شیوہ رد بدعات کا اور مبتدعین سے دوری کا اس کو قائم رکھیں۔ جو کچھ نصیحت آپ کے لیے ڈاکٹر صاحب نے کی، امام بخاری ﷫ کا قول آپ نے سن لیا کہ ایک ہزار اسی میرے استاد تھے۔ اور میں نے ایسے کسی شیخ سے حدیث نہیں لی جس نے عمل کو ایمان کا حصہ نہ مانا ہو۔ یہ ان کے عقیدے کی غیرت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے مشائخ کی تعداد بڑھ سکتی تھی، لیکن میں نے ایسے مشائخ کو چھوڑ دیا جنھوں نے عمل کو ایمان نہیں مانا۔ مُرجۂ سے میں نے حدیث کو نہیں لیا، یہ ان کے عقیدے کی غیرت ہے۔ تو یہ غیرت اپنے اندر پیدا کریں اور مبتدعین

سے ایک ہی تعلق ہونا چاہیے، وہ تعلقِ دعوت ہے۔ ایسا تعلق جو خارجی سطح پر کسی اکرام اور تعظیم پر قائم نہ ہو۔ وہ اکرام اور تعظیم دھوکے کا باعث ہے اس شخص کے لیے بھی اور باقی دیکھنے والوں کے لیے بھی۔ اللہ رب العزت کتاب وسنت پر استقامت دے اور پیغمبر علیہ السلام کی سنت کی معرفت، سلف صالحین کے فہم اور ان کے منہج کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمادے، بدعت سے محفوظ رکھے اور شرک سے محفوظ رکھے۔ اللہ رب العزت کل قیامت کے دن میزان کے حساب کے موقع پر ہمارے ہر عمل کو اخلاص اور پیغمبر علیہ السلام کی سنت کے معیار پر قائم فرمادے۔ اور ہم سب کو کامیابی عطا فرمادے۔

«وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ»